نورجہاں سرورِ جاں

ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

نورجہاں سرورِجاں

سعادت حسن منٹو

مکتبۂ شعروادب
۷، ڈی۔ بلاک سی
سمن آباد — لاہور

جملہ حقوق بحق صفیہ منٹو محفوظ ہیں

ناشر ــــــــ نواز چودھری

اشاعت ــــــــ ۱۹۷۵ء

مطبع ــــــــ ندرت پرنٹرز لاہور

قیمت ۱۲ روپے

پیش لفظ

میں اس سے قبل ایک مجموعہ "گنجے فرشتے" کے عنوان سے لکھ چکا ہوں جو شائع ہو چکا ہے۔ میں نے اس میں ان ایکٹروں، ایکٹرسوں، شاعروں اور ادیبوں کے متعلق اپنے تاثرات پیش کیے تھے جن کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں۔

اب اسی قسم کا ایک اور سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ اس کی ابتدا مشہور مغنیہ اور ایکٹرس نورجہاں سے ہوئی ہے۔ جس سے میری ملاقات بمبئی میں ہوئی تھی۔ مگر اس کا تذکرہ یہاں فضول ہے کہ آپ میرے جملہ تاثرات اس مضمون میں پڑھ لیں گے جو مکتبہ "ڈائریکٹر" کتابچے کی صورت میں شائع کر رہا ہے۔

یہ سلسلہ کچھ نیا ہوگا کہ ہر وہ مضمون جو میں ایکٹروں، ایکٹرسوں اور دیگر شخصیتوں کے بارے میں لکھوں گا، کتابچے کی صورت میں ہوگا۔ تاکہ قارئین کو زیادہ انتظار کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ لیکن جب یہ سلسلۂ مضامین ختم ہو جائے گا۔ تو مکتبہ "ڈائریکٹر" اسے دوبارہ کتابت کرا کے پورے مجموعہ کی صورت میں شائع کرے گا۔ جسے آپ اپنی لائبریری کی زینت بنا سکیں گے۔

اس سلسلہ کا دوسرا مضمون غالباً مشہور رقاصہ ستارہ سے متعلق ہوگا کہ فلمی دنیا میں اس کی شخصیت مجھے بہت دلچسپ نظر آئی۔ وہ ایک سمندر ہے جس کو مجھے ایک چھوٹے سے کوزے میں بند کرنا پڑے گا۔

اس کے بعد کلدیپ کور کا نمبر ہوگا۔ امرتسر کے مشہور سکھ خاندان کی بیٹی، جسے حال ہی میں بھارت والوں نے پاکستان کا جاسوس قرار دیا ہے۔ اس کے بعد جو کچھ آئے گا وہ آپ کو میرے اس سلسلہ کے دوسرے کتابچے کے مطالعہ سے معلوم ہو جائے گا۔

سعادت حسن منٹو

۲۵ جولائی ۱۹۵۲ء

میں نے شاید پہلی مرتبہ نورجہاں کو فلم "خاندان" میں دیکھا تھا۔ اس زمانے میں وہ بے بی تھی۔ حالانکہ پردے پر وہ ہرگز ہرگز اس قسم کی چیز معلوم نہیں ہوتی تھی: اس کے جسم میں وہ تمام خطوط، وہ تمام قوسیں موجود تھیں جو ایک جوان لڑکی کے جسم میں ہو سکتی ہیں۔ اور جن کی وہ بوقتِ ضرورت نمائش کر سکتی ہے۔

نورجہاں ان دنوں فلم بین لوگوں کے لیے ایک فتنہ تھی، قیامت تھی، لیکن مجھے اس کی شکل و صورت میں ایسی کوئی چیز نظر نہ آئی، ایک فقط اس کی آواز قیامت خیز تھی۔ سہگل کے بعد، میں نورجہاں کے گلے سے متاثر ہوا۔ اتنی صاف و شفاف آواز، مرکیاں اتنی واضح کھرج اتنا ہموار، پنچم اتنا نوکیلا!۔ میں نے سوچا، اگر یہ لڑکی چاہے تو گھنٹوں ایک سُر پہ کھڑی رہ سکتی ہے، اسی طرح، جس طرح بازیگر تنے ہوئے رسّہ پہ بغیر کسی لغزش کے کھڑے رہتے ہیں۔

نورجہاں کی آواز میں اب وہ لوچ، وہ رس، وہ بچپنا اور وہ معصومیت نہیں رہی، جو اس کے گلے کی امتیازی خصوصیّت تھی، لیکن پھر بھی نورجہاں، نورجہان ہے۔ گو لتا منگیشکر کی آواز کا جادو آجکل ہر جگہ چل رہا ہے۔ اگر کبھی نورجہان کی آواز فضا میں بلند

ہو۔ تو کان اس سے بے اعتنائی نہیں برت سکتے۔

نورجہاں کے متعلق بہت کم آدمی جانتے ہیں کہ وہ راگ ودّیا اتنا ہی جانتی ہے جتنا کوئی اُستاد۔ وہ ٹھمری گاتی ہے، خیال گاتی ہے۔ دھرپد گاتی ہے۔ اور ایسا گاتی ہے کہ گانے کا حق ادا کرتی ہے۔

موسیقی کی تعلیم تو اُس نے یقیناً حاصل کی تھی کہ وہ ایسے گھرانے میں پیدا ہوئی، جہاں کا ماحول ہی ایسا تھا۔ لیکن ایک چیز خداداد بھی ہوتی ہے۔ موسیقی کے علم سے کسی کا سینہ معمور ہو، مگر گلے میں رَس نہ ہو تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ خالی خولی علم سننے والوں پر کیا اثر کرسکے گا۔

نورجہاں کے پاس علم بھی تھا اور وہ خداداد چیز بھی کہ جسے گلا کہتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں مل جائیں تو قیامت کا برپا ہونا لازمی ہے۔

میں یہاں آپ کے لیے ایک دلچسپ بات بتاؤں کہ وہ لوگ جن پر خدا کی مہربانی ہوتی ہے، وہ اس سے ناجائز فائدہ بھی اُٹھاتے ہیں۔ میرا مطلب ابھی آپ پر واضح ہوجائے گا۔

چاہیئے تو یہ کہ جو چیز خدا نے عطا کی ہو، اس کی حفاظت کی جائے۔ تاکہ وہ مسخ نہ ہو۔ لیکن میں نے اکثر دیکھا ہے کہ لوگ ان کی پروا نہیں کرتے۔ بلکہ غیر شعوری یا شعوری طور پر پوری کوشش کرتے ہیں کہ وہ تباہ و برباد ہوجائے۔

شراب گلے کے لیے سخت غیر مفید ہے۔ لیکن سہگل مرحوم

ساری عمر بلانوشی کرتے رہے۔ کھٹی اور تیل کی چیزیں گلے کے لیے تباہ کن ہیں۔ یہ کون نہیں جانتا؟ مگر نورجہاں پاؤ پاؤ بھر تیل کا اچار کھا جاتی ہے۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ، جب اُسے ناکے لیے گانا ہوتا ہے تو وہ خاص اہتمام سے پاؤ بھر اچار کھائے گی۔ اس کے بعد برف کا پانی پیئے گی۔ پھر مائیکروفون کے پاس جائے گی۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ "اس طرف آواز نکھر جاتی ہے"۔

یوں آواز کیونکر نکھرتی ہے، گلا کیسے صاف ہوتا ہے، اس کے متعلق نورجہاں ہی بہتر جانتی ہے۔ یوں میں نے اشوک کمار کو بھی برف استعمال کرتے دیکھا ہے کہ جب اُسے گانے کی صدابندی کرانا ہوتی ہے تو وہ سارا وقت برف کے ٹکڑے چباتا رہتا ہے۔

جب تک ریکارڈ زندہ ہیں، سہگل مرحوم کی آواز کبھی نہیں مر سکتی۔ اسی طرح نورجہاں کی آواز بھی ایک عرصے تک زندہ رہے گی۔ اور آنے والی نسلوں کے کانوں میں اپنا شہد ٹپکاتی رہے گی۔

نورجہاں کو میں نے صرف پردے پر دیکھا تھا۔ میں اس کی شکل و صورت اور اداکاری کا نہیں، اُس کی آواز کا شیدائی تھا۔ وہ کم عمر تھی۔ اس لیے مجھے حیرت تھی کہ وہ کیونکر اتنے دلفریب طریقے سے گا سکتی ہے۔ اُن دنوں دو آدمیوں کا دور دورہ تھا۔ مرحوم سہگل کا اور نورجہاں کا۔

یوں تو اُن دنوں خورشید چھائی ہوئی تھی، شمشاد کے در بھی چرچے تھے مگر نورجہاں کی آواز میں سب کی آواز دب گئی۔
ثریا بعد کی پیداوار ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ سہگل اور ثریا تو اکٹھے فلم میں پیش ہوئے لیکن نورجہاں اور وہ دونوں الگ الگ رہے۔ معلوم نہیں پروڈیوسروں کے دماغ میں ان دونوں کو یکجا کرنے کا خیال پیدا نہ ہوا۔ یا کسی اور وجہ سے پروڈیوسر ان کو ایک فلم میں کاسٹ نہ کر سکے۔ بہرحال مجھے اس کا افسوس ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اگر وہ دونوں آمنے سامنے ہوتے تو موسیقی کی دنیا میں نہایت خوشگوار انقلاب برپا پیدا ہوتا۔
نورجہاں سے میری پہلی ملاقات کیسے ہوئی، کب ہوئی اور کہاں ہوئی؟ یہ ایک لمبی داستان ہے — میں کئی برس تک بمبئی کی فلمی دنیا میں گزار کر چند وجوہ کی بنا پر دل برداشتہ ہو کر دہلی چلا گیا۔ وہاں پر میں نے آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت کر لی۔ مگر یہاں سے بھی دل اچاٹ ہو گیا۔ بمبئی سے "مصور"، کے ایڈیٹر نذیر لدھیانوی کے متعدد خطوط آئے کہ تم واپس چلے آؤ — ! "خاندان" کے ڈائرکٹر شوکت حسین رضوی یہاں آئے ہوئے ہیں اور میرے ہی پاس ٹھہرے ہیں۔ ان کی یہ خواہش ہے کہ تم اُن کے لیے ایک کہانی لکھو۔
میں دہلی چھوڑ کر چلا گیا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے کہ جب کرپس مشن فیل ہو چکا تھا۔ میں غالباً، اگست ۴۲ء کو

بمبئی پہنچا۔ شوکت سے میری پہلی ملاقات، ۱۷ اڈلفی چیمبرز کلیئر روڈ پر ہوئی۔ جو دفتر بھی تھا اور رہائشی مکان بھی۔

بڑا بانکا چھیلا نوجوان تھا۔ گورا رنگ، گالوں پر سرخی، مہین مہین جون گلبرٹ اسٹائل کی مونچھیں، گھنے گھریلے بال۔ لمبا قد۔ بہت خوش پوشش، بے داغ پتلون، شکنوں سے بے نیاز کوٹ ٹائی کی گرہ نہایت عمدہ۔ چال میں لٹک۔ ہم پہلی ملاقات میں ہی خوب گھل مل گئے۔

میں نے اس کو بہت مخلص انسان پایا۔ میں دہلی سے اپنے ساتھ اپنے پسندیدہ سگریٹ یعنی کریون اے کا کافی سٹاک لے کر آیا تھا۔ جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ اس لیے بمبئی میں یہ سگریٹ قریب قریب نایاب تھے۔ شوکت نے میرے پاس بیس پچیس ڈبے اور پچاس کے قریب ڈبیاں دیکھیں تو بہت خوش ہوا۔

ہم دونوں کا قیام وہیں ۱۷ اڈلفی چیمبرز میں تھا۔ دو کمرے تھے۔ جہازی سائز کے۔ ایک میں دفتر تھا، دوسرے میں رہائشی معاملہ! مگر رات کو ہم دفتر میں سوتے تھے۔ مرزا مشرف، وغیرہ آجاتے تھے وہ ہماری چارپائیاں بچھا دیتے تھے۔

جب تک شوکت وہاں رہا، بڑے ہنگامے رہے، کریون اے کے سگریٹ اور ناسک کی ہرن مار کر وسکی جو بڑی واہیات تھی — لیکن اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ شوکت "خاندان" کے بعد گو بہت بڑا ڈائرکٹر بن گیا تھا۔ مگر لاہور سے بمبئی پہنچنے اور وہاں

کچھ دیر رہنے کے دوران میں وہ سب کچھ خرچ ہو چکا تھا۔ جو انھوں نے لاہور میں فلم کی ہنگامی اور اخراجات سے پُر زندگی گزارنے کے بعد پس انداز کیا تھا۔ — اور میرے پاس تو صرف چند سو تھے جو کہ ہرن مار کر وِسکی میں غرق ہو گئے۔

بہرحال کسی نہ کسی حیلے گزر ہوتا رہا۔ وہ وقت بہت نازک تھا۔ میں سات اگست کو وہاں پہنچا اور ۹ اگست کی صبح کو جب میں نے کہیں ٹیلی فون کرنے کی کوشش کی تو لائن "ڈیڈ" یعنی مردہ تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ کانگریسی لیڈروں کی گرفتاریاں چونکہ عمل میں آ رہی تھیں۔ اس لیے احتیاطاً ٹیلی فون کا سارا سلسلہ منقطع کر دیا گیا تھا۔

گاندھی جی، جواہر لعل نہرو اور ابوالکلام آزاد وغیرہ سب گرفتار کر لیے گئے۔ اور کسی نامعلوم جگہ منتقل کر دیئے گئے۔ شہر کی فضا بالکل ایسی تھی جیسے بھری بندوق۔ باہر نکلنے کا تو سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ کئی دن تک ہم ہرن مار کر شراب پی کر اپنا وقت کاٹتے رہے۔ اس دوران فلم انڈسٹری میں بھی انقلاب برپا ہو چکا تھا۔ حالات چونکہ غیر یقینی تھے اس لیے کسی نئے فلم کی تیاری کون کرتا۔ چنانچہ جن لوگوں سے شوکت کی بات چیت ہو رہی تھی، ایک غیر معینہ عرصے کے لیے کھٹائی میں پڑ گئی، اور ہم نذیر لدھیانوی کے ہاں پکے ہوئے بدمزہ کھانے کھا کر لمبی تان کر سوتے رہے لیکن پھر بھی کبھی کبھار زندگی کے آثار پیدا ہو جاتے تھے۔ اور ہم کہانیوں کے متعلق سوچنا شروع کر دیتے تھے۔

اسی دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ نورجہاں بھی بمبئی میں ہے۔ لیکن ٹھہریئے! میں آپ کو بتاؤں کہ مجھے کیسے معلوم ہوا۔ میرا حافظہ جواب دے گیا تھا۔ اصل میں مجھے یہ آٹھ اگست ہی کو معلوم ہوگیا تھا جبکہ میری ملاقات ابھی شوکت سے نہیں ہوئی تھی۔ مجھے ماہم جاکر اپنے چند رشتہ داروں سے ملنا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے ایک ریڈیو آرٹسٹ ثمینہ کا پتہ لینا تھا۔ (بعد میں کرشن چندر سے جس کے مراسم رہے)۔ اس لڑکی کو میں نے آل انڈیا ریڈیو دہلی سے بمبئی بھیجا تھا۔ کیونکہ اس کو فلم میں کام کرنے کا شوق تھا۔ میں نے اسے پرتھوی راج اور برج موہن کے نام تعارفی خط لکھ کر دے دیئے تھے۔ اور اب میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آیا وہ فلمی دنیا میں داخل ہو چکی ہے یا نہیں!۔ لڑکی ذہین تھی، کردار اس کا بہت اچھا تھا۔ مکالمے بہت روانی کے ساتھ ادا کرتی تھی۔ شکل و صورت کی بھی خاصی تھی۔ اس لیے مجھے یقین تھا کہ وہ کامیاب ہوگئی ہوگی۔

مجھے پتہ چلا کہ وہ شیواجی پارک میں کہیں رہتی ہے۔ مگر یہ اتنی بڑی جگہ ہے کہ ثمینہ خاتون کا پتہ لگانا بہت مشکل تھا۔ چنانچہ میں نظامی صاحب کے ہاں روانہ ہوگیا جو قریب ہی کیڈل روڈ پر رہتے تھے۔ مجھے ان کا ایڈریس معلوم تھا۔ کہ وہ اکثر مجھے خط لکھتے رہتے تھے۔ یہ وہی نظامی ہیں جنہوں نے ممتاز شانتی کو تربیت دی۔ جن کے پاس دلی صاحب برسوں

پڑھتے رہے اور آخر میں ممتاز شانتی کو نظامی صاحب کے بتائے ہوئے اصولوں کے تحت ہی لے اُڑے۔ یہ وہی نظامی صاحب ہیں جن کی بیوی گیتا نظامی کے نام سے فلمی دنیا میں مشہور ہوئی۔ اور جس نے نظامی صاحب کو لات مار کر پے در پے کئی شادیاں کیں۔ عدالتوں میں جس کے کئی مقدمے چلے اور جو اب ایک نئی خوبصورت زندگی کے ساتھ ڈانس پارٹی بنا کر شہر بہ شہر پاکستان کا پرچار کر رہے ہیں۔

نظامی صاحب سے میری ملاقاتیں صرف خطوط تک ہی محدود تھیں اور وہ بھی بڑے رسمی تھے۔ میں نے ان کو پہلی مرتبہ ان کے فلیٹ پر دیکھا۔ میں اگر اس ملاقات کو بیان کروں تو میرا خیال ہے، دس پندرہ صفحے اس کی نذر ہو جائیں گے۔ اسی لیے میں اختصار سے کام لوں گا۔

نظامی صاحب جو کہ دھوتی اور بنیان پہنے تھے۔ مجھے بڑے تپاک سے ملے۔ انھوں نے میرے آنے کا مقصد پوچھا، جو میں نے عرض کر دیا۔ آپ نے کہا۔ "وہ ثمینہ خاتون ابھی آپ کے قدموں میں حاضر ہو جائے گی۔"

ان کا ایک مریل قسم کا ہندو مینجر تھا۔ اس کو آپ نے حکم دیا کہ منٹو صاحب کے لیے فوراً ثمینہ خاتون کو حاضر کرو۔ یہ حکم دینے کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ اور کہا کہ وہ میرے لیے ہر قسم کی خدمت کے لیے حاضر ہیں۔ چنانچہ انھوں نے فوراً زبانی طور پر میرے

لیے ایک عمدہ فلیٹ، بہترین فرنیچر اور ایک عدد کارنہ کا بندوبست کر دیا۔

ظاہر ہے کہ میں بہت خوش ہوا۔ چنانچہ میں نے مناسب۔ اور موزوں الفاظ میں ان کا شکریہ ادا کیا۔ جس کی ان کو بالکل ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے کہ وہ میرے افسانوں کے گرویدہ تھے۔ قارئین سے مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ نظامی صاحب زبانی جمع خرچ کے بادشاہ ہیں۔

نظامی کچھ بھی ہو، لوگ اسے بھڑوا کہیں، کنجر کہتے ہیں۔ کچھ بھی ہو۔ مجھے اس کا حدود اربعہ معلوم نہیں لیکن میرا مطالعہ یہ کہتا ہے کہ وہ ایک مہم گو انسان ہے۔ وہ اپنے فن میں پوری پوری مہارت رکھتا ہے۔ میں نے اس روز، یعنی پہلی ملاقات کے دن ہی دیکھا ممتاز شانتی پر اس کا اتنا رعب داب تھا کہ کسی باپ کا بھی نہیں ہو سکتا۔ اور ولی صاحب اس کے سامنے یوں جھکتے تھے کہ جیسے کوئی سائیس!۔

وہ اس گھر کا بادشاہ تھا جس کو سب خراج ادا کرتے تھے۔ اس کا کام صرف پروڈیوسروں کو کھانے اور شراب کی دعوتیں دینا، اور بلیک مارکیٹ سے پٹرول خریدنا تھا۔ اور ممتاز شانتی کو کامیاب ہونے کے گر بتانا تھا۔ کہ دیکھو! اگر تم یوں مسکراؤ گی تو فلاں پروڈیوسر سے تمہیں کنٹریکٹ لینے کا ذمہ میں لیتا ہوں۔ اگر تم فلاں کے بیٹھ سے یوں ہاتھ ملاؤ گی تو اس کا مطلب ہے کہ

دس ہزار روپے اسی رات ہماری جیب میں ہوں گے ۔

میں وہاں بیٹھا تھا اور حیران ہو رہا تھا کہ میں کس دنیا میں آنکلا ہوں۔ وہاں ہر چیز مصنوعی تھی۔ ولی صاحب، نظامی صاحب کے حکم پہ اُن کا سلیپر اٹھا کے لاتے اور جھک کر ان کے قدموں میں رکھ دیا۔ اس میں بناوٹ تھی ۔۔۔ خدا کی قسم! یکسر بناوٹ تھی۔

اور ممتاز شانتی دوسرے کمرے میں معمولی لباس میں ۔۔ نہایت معمولی لباس میں، کھڑکی کے پردوں کے لیے کپلیں ٹھونک رہی تھی، اور نظامی کہہ رہا تھا۔ " منٹو صاحب! یہ بچی نہایت سادہ ہے ۔ فلم لائن میں رہ کر بھی اسے آس پاس کی دنیا کا کچھ علم نہیں۔ مردوں کی طرف تو یہ نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی اور یہ سب میری تربیت کا نتیجہ ہے۔"

میرا دل کہتا تھا کہ یہ سب فراڈ ہے، یہ سب جعل ہے، لیکن مجھے نظامی صاحب کی اُن کے منہ کے سامنے تعریف کرنا پڑی۔

لیکن بات، نورجہاں کی ہو رہی تھی۔

ممتاز شانتی کو سیدھے راستے پر لگانے اور اس کو صالح تربیت دینے کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں۔ تو نظامی صاحب نے نورجہاں کا ذکر کیا اور مجھے بتایا کہ ان دنوں وہ بھی ان کے زیرِ سایہ ہے۔ اور ممتاز کی طرح تربیت حاصل کر رہی ہے۔ آپ نے کہا:

" منٹو صاحب! اگر یہ لڑکی زیادہ دیر لاہور میں رہتی تو اس کا بیڑہ غرق ہو جاتا۔ میں نے اسے یہاں اپنے پاس بلا لیا ہے اور سمجھایا ہے

کہ دیکھو بیٹا! صرف فلم سٹار بننے سے کچھ نہیں ہوگا۔ کوئی سہارا بھی ہونا چاہیئے۔ اول تو شروع میں عشق لڑانے کی کوئی ضرورت نہیں ادھر ادھر دونوں طرف سے خوب کماؤ۔ جب بینک میں تمہارا کافی روپیہ جمع ہو جائے تو کسی ایسے شریف آدمی سے شادی کر لو جو ساری عمر تمہارا غلام بن کے رہے۔ آپ کا کیا خیال ہے منٹو صاحب! آپ تو بڑے دانا ہیں؟"

میری ساری دانائی تو نظامی صاحب کے فلیٹ میں داخل ہوتے ہی نیچے فٹ پاتھ پر بھاگ گئی تھی۔ میں کیا جواب دیتا؟ بس کہہ دیا کہ آپ جو کر رہے ہیں وہ مصلحت کے خلاف کیونکر ہو سکتا ہے۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے آواز دے کر نور جہاں کو بلایا مگر اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور چند لمحات کے بعد نور جہاں کی آواز کسی کمرے سے آئی۔ "ابھی آتی ہوں، کمال صاحب کا فون آیا ہے۔"

نظامی صاحب زیر لب مسکرائے۔ یہ کمال صاحب، حیدر امروہی تھے۔ "پکار کے شہرت یافتہ" نظامی صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "میں عرض کر رہا تھا کہ سہارا ہونا چاہیئے تو نور جہاں کے لیے کمال امروہی سے بہتر سہارا اور کون ہو سکتا ہے۔ لیکن میں اس سے صاف صاف کہہ چکا ہوں کہ شادی وادی کا معاملہ غلط ہے بس اپنا اُلّو سیدھا کیے جاؤ۔ کمال کما سکتا ہے۔ اس لیے آدمی کمائی اگر نور جہاں کو مل جایا کرے تو کیا ہرج ہے۔ اصل میں منٹو صاحب ان ایکٹرسوں کو مذہبی کملانے کے گر آنے چاہئیں۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "آپ گرو جو ہو بدہ ہیں۔"
نظامی خوش ہو گیا اور اس نے مجھے فوراً ایک فسٹ کلاس لیمن سکواش پلا یا۔

بس یہاں — نظامی صاحب کے فلیٹ میں، جہاں نور جہاں کی سائنٹیفک طریقے پر تربیت ہو رہی تھی۔ اس کو وہ تمام جائز خاص نظامی صاحب کی نگرانی میں سکھائے جا رہے تھے۔ میری نور جہاں سے سرسری سی ملاقات ہوئی، اور میرا ردِّ عمل یہ تھا کہ یہ لڑکی اپنی جوانی کی منزلیں بڑی سرعت سے طے کر رہی ہے اور جس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور ہنسی تجارتی رنگ اختیار کر رہی ہے، اور جو موٹاپے کی طرف مائل ہے، اپنے استاد کی بہترین شاگرد ثابت ہو گی۔

لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

نظامی کی خواہش دراصل یہ تھی کہ جس طرح ممتاز شانتی اس کے قبضے میں ہے اور اس کا رعب داب تسلیم کرتی ہے۔ اسی طرح وہ ایک بوڑھی نائکہ کی طرح نور جہاں کو بھی اپنی نوچی بنالے۔
—— ممتاز شانتی کی ساری آمدن نظامی کی تحویل میں رہتی تھی۔ ظاہر ہے کہ ممتاز شانتی کے مقابلے میں نور جہاں کی قدر و قیمت بہت زیادہ تھی اور لنگڑا ہوشیار دماغ اچھی طرح جانتا تھا کہ نور جہاں کا مستقبل خیرہ کن ہے۔ چنانچہ وہ اس کو اپنے جال میں پھنسانے کی تیاریاں مکمل کر رہا تھا کہ . . . . .

سید شوکت حسین رضوی بمبئی پہنچ گیا۔ وہ شوکت، وہ رضوی

جس سے نورجہاں کا عشق پنچولی اسٹوڈیوز میں لڑ چکا تھا۔ مقدمہ بازی بھی ہو چکی تھی اور بچنے کی خاطر نورجہاں نے عدالت میں یہ بیان دیا تھا کہ شوکت صاحب سے اس کا کوئی ناجائز تعلق نہیں، وہ تو انھیں اپنا بھائی سمجھتی ہے۔

نورجہاں کا یہ عدالتی بھائی اب بمبئی میں موجود تھا۔ وسیع وعریض بمبئی میں، جو فلمی دنیا کی ہالی وڈ تھی۔

میں نے شوکت سے بات کی کہ میں نورجہاں سے ملا ہوں۔ اس وقت مجھے ان کے رومان کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا۔ میں یہ تو جانتا تھا کہ دونوں کے تعلقات کشیدہ ہیں۔ میں نے صرف برسبیل تذکرہ اس کو بتایا تھا کہ نورجہاں سے میری ملاقات نظامی صاحب کے گھر میں ہوئی ہے۔ ہرن مارکہ شراب کا گلاس زور سے تپائی پر رکھ کر اس نے بڑی تند ہی سے کہا۔ "لعنت بھیجو اس پر"

میں نے ازراہِ مذاق کہا۔ "میں ہزار بار اس کے لیے تیار ہوں، مگر بھئی! وہ تمہارے "خاندان" کی ہیروئن رہ چکی ہے۔"

شوکت ذہین ہے۔ فوراً سمجھ گیا کہ میں لفظ "خاندان" پر کھیلا ہوں اور اسے ذو معنی استعمال کیا ہے۔ ہنس کر اداۓ منٹو تم بہت شریر ہو۔ لیکن بات یہ ہے کہ میں اس کے متعلق کوئی بات نہیں سننا چاہتا۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ بمبئی میں ہے۔ سالی! میرے پیچھے پیچھے آئی ہے۔ لیکن مجھے اب اس سے کوئی سروکار نہیں۔"

میں نے جب اس کو بتایا کہ وہ کمال امروہی کو ٹیلیفون کر رہی تھی۔

اور ببر کہ نظامی ان دونوں کو قریب لانا چاہتا ہے تو میں نے محسوس کیا کہ وہ بظاہر بے اعتنائی اور بے پرواہی ظاہر کر رہا ہے۔ مگر اندرونی طور پر سخت بے چین ہو گیا ہے۔ اس لیے فوراً ہی ہرن مارکہ وسکی کا ایک اودھا منگوایا اور ہم رات دیر تک پیتے رہے۔

اس دوران میں بلیے وقفوں کے بعد نورجہاں کا ذکر چھڑ جاتا تھا۔ میں نے شوکت کی گفتگو سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ ابھی تک اس کی محبت میں گرفتار ہے۔ بھائی والا معاملہ تو محض حکمت عملی تھا اُس کو وہ راتیں یاد آ رہی تھیں جب نغموں کی ننھی منی شہزادی اُس کی آغوش میں ہوتی تھی۔ اور جب غالباً دونوں ایک دوسرے سے جُدا نہ ہونے کی قسمیں کھایا کرتے تھے۔

میں نے ایک دن شوکت سے پوچھ ہی لیا۔ " دیکھو یار بتاؤ! سچ سچ بتاؤ ——— کیا تمہیں نورجہاں سے محبت نہیں ہے؟"

شوکت نے زور سے اپنے سگریٹ کی راکھ جھاڑی اور کسی قدر کھسیانے پن سے کہا۔ " ہے یار —— ہے —— مگر لعنت بھیجو اس پر۔ میں اس کو آہستہ آہستہ بھول جاؤں گا۔"

لیکن قدرت زیر لب مسکرا رہی تھی، وہ جو فیصلہ کر چکی تھی، اٹل تھا۔ شوکت کا کنٹریکٹ سیٹھ وی۔ ایم ویاس سے ہوا۔ جو اس سے پہلے ایک فلم کے لیے نورجہاں سے معاہدہ کر چکا تھا۔

اب لگے ہاتھوں سیٹھ وی۔ ایم ویاس کے متعلق بھی سن لیجیے۔ یہ ایک کائیاں آدمی ہے۔ شروع شروع میں طبلچی تھا۔ پھر کیمرہ قلی ہوا۔

آہستہ آہستہ کیمرہ مین بن گیا۔ ترقی کے اور زینے طے کیے تو ڈائرکشن کا موقع مل گیا۔ یہاں سے چھلانگ لگائی تو پروڈیوسر اب وہ ڈائرکٹر اور پروڈیوسر ہے اور لاکھوں میں کھیل رہا ہے۔

بہت ہی مسخنی قسم کا انسان ہے۔ مجھ سے بھی کہیں پتلا۔ اتنا پتلا کہ اُسے قمیص کے نیچے ایک موٹا اُونی بنیان پہننا پڑتا ہے کہ اس کی پسلیاں لوگوں کو نظر نہ آئیں۔ مگر بلا کا پھرتیلا ہے اور بڑا محنتی۔ اس کے مقابلے میں پہلوان تھک جائیں گے مگر وہ ڈٹا رہے گا۔ جیسے مشقت اس پر اثر انداز ہو ہی نہیں سکتی۔

اس کی ایک خوبی اور ہے کہ وہ اپنے ذاتی سرمائے سے فلم نہیں بناتا۔ ایک فسلم تیار کر کے اور اس کو ٹھکانے لگا کر وہ اپنے دوسرے فلم کا اعلان کر دیتا ہے۔ اس وقت کے جتنے اونچے ستارے ہوتے ہیں وہ اپنی کاسٹ میں جمع کر لیتا ہے۔ کہانی کا اس وقت نام ونشان تک نہیں ہوتا۔ کوئی نہ کوئی "فائی نینسر" اس کے دام میں آجاتا ہے۔ چنانچہ اس سے روپیہ لے کر وہ 'کالی' کا نام لے کر کام شروع کر دیتا ہے۔

نورجہاں بمبئی آئی تو اُس کو پتہ چل گیا چنانچہ اس نے فوراً ہی نورجہاں سے کنٹریکٹ کر لیا۔ اس لیے کہ وہ جانتا تھا کہ "خاندان" اور دوسرے فلموں کی قابل رشک کامیابی کے بعد اس کا نام ہی کسی "فائی نینسر" کو پھانسنے کے لیے کافی ہے۔ اور جب اس کو معلوم ہوا کہ خاندان کا ڈائرکٹر بھی بمبئی میں موجود ہے تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اس "

نے فوراً اپنے کارندے دوڑائے۔ شوکت حسین رضوی سے کئی حلا فائنیں کیں اور اس کے ساتھ بھی ایک پکچر کا معاہدہ کر لیا۔
فلم کیا ہوگا؟ کیسا ہوگا؟ کہانی کیا ہے؟ یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ مگر سیٹھ دی۔ ایم دیاس نے جب اپنے فائی نینسر کو نورجہاں اور شوکت سے اپنی "سن رائیز پکچرز" کے کنٹریکٹ دکھائے تو مطلوبہ سرمایہ کسی دقت کے بغیر فوراً مل گیا۔
قدرت بھی عجیب کھیل کھیلتی ہے۔ نہ شوکت کو معلوم تھا کہ نورجہاں "سن رائیز" میں آچکی ہے اور نہ نورجہاں کو پتہ تھا کہ اس کا عدالتی بھائی شوکت بھی اس کا ہمراہی ہے: بڑی لمبی داستان ہے۔ میں اسے مختصر کرنا چاہتا ہوں۔
ایک دن یہ راز فاش ہو گیا۔ نظامی بہت گھبرایا کہ ایسا نہ ہو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔ جو فلم شوکت کو ڈائرکٹ کرنا تھی، اس کی ہیروئن نورجہاں مقرر کی گئی تھی۔ دونوں کا "فیز ملن" نظامی کے لیے بڑا اندوہناک ثابت ہو سکتا تھا۔ چنانچہ نورجہاں کے والی کی حیثیت سے اس نے سیٹھ دیاس سے کہا کہ وہ ہرگز ہرگز اس قسم کا سلسلہ برداشت نہیں کرے گا۔ مگر سیٹھ دیاس نظامی سے کچھ زیادہ ہی کائیاں نکلا کہ اس نے اپنی گجراتی حکمت عملی سے جو کہ پنجابی حکمت عملی کے معاملے میں بڑی گہری اور دھاندسو قسم کی ہوتی ہے۔ نظامی کو ہموار کر دیا اور وہ راضی ہو گیا کہ نورجہاں شوکت کی پکچر میں کام کرے گی۔ اور ضرور کرے گی، چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو

جائے۔ چنانچہ وہیں دفتر میں دونوں نے ایک دوسرے سے معانقہ کیا۔ ہاتھ ملائے اور ایک دوسرے کے بھائی بن گئے۔

اب دونوں اپنی اپنی جگہ پر خوش تھے۔ سیٹھ وباسں اس لیے کہ اس نے اپنا اُلّو سیدھا کر لیا تھا، اور نظامی اس لیے کہ اس نے ایک فلمی سیٹھ کی خوشنودی حاصل کر لی تھی۔ اور اس کو زیرِ احسان کر لیا تھا۔ سیٹھ، باسں کٹر قسم کا وشنو تھا۔ ورنہ نظامی اسے اسی رات گھر بلا کر ممتاز شانتی کے ہاتھ کے پکے ہوئے مرغ اور پلاؤ سے اپنی اور اس کی دوستی ضرور مستحکم کرتا۔ اور اگر سیٹھ بوتل کا رسیا ہوتا تو وہ اپنے مربی منیجر کے ذریعے سے دو عدد سکاچ بلیک مارکیٹ سے ضرور منگواتا۔

بہر حال بات "پکی" ہو گئی۔ کیونکہ نظامی سینے پر ہاتھ رکھ کر سیٹھ وباسں سے کہہ چکا تھا کہ "سیٹھ! اب جبکہ تم نے مجھے بھائی کہہ دیا ہے۔ میں تم کو بچن دیتا ہوں کہ مینہ یا آندھی یا...... طوفان بھی ہو— تمہاری شوٹنگ ہو گی تو بے بی نورجہاں وقت پر پہنچے گی۔

اب ایک لطیفہ سنیئے۔ بات تو خیر پکی ہو گئی تھی۔ میرا بھی سیٹھ وباسں سے ایک کہانی کے لیے کنٹریکٹ ہو گیا تھا۔ چنانچہ میں اور شوکت اس کا موضوع تلاش کرنے میں مصروف تھے۔ "پیشگیاں" مل چکی تھیں۔ اس لیے ناسک کی ہرن مارکہ وسکی کی فراوانی تھی۔ دور پر دور چلتے تھے۔ مرزا مشرف، چاولہ اور سہگل (یہ دونوں حضرات اب بڑے ڈائرکٹر بن چکے ہیں) ہماری اردلی میں ہوتے تھے،

، ذرا وسکی ختم ہوئی اور چاولہ بھاگے ناگپاڑے۔ کسی اور چیز کی ضرورت ہوتی تو مرزا مشرف حاضر تھے۔

لطیفے میں سے لطیفہ نکلتا ہے۔ مرزا مشرف ہمارے ساتھ پیتے تھے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ تیسرے پگ کے بعد رونا شروع کر دیتے۔ زار و قطار روتے تھے۔ شوکت کے ہاتھ پاؤں چومتے اور وہ شکوک جو شوکت کے دل میں ان کے بارے میں کبھی گزرے بھی نہیں تھے، ان کا ذکر کرتے اور کہتے تھے کہ وہ سب غلط ہیں۔ اس کے بعد وہ رو رو کر اپنی نئی بیاہتا بیوی کو یاد کرنے لگتے تھے۔ اور پھر گانا سنانا شروع کر دیتے تھے۔۔ یہ سب فراڈ یعنی جعل تھا۔ مگر فلمی دنیا میں اس کے سوا اور ہوتا بھی کیا ہے؟

اب میں اصل لطیفے کی طرف آتا ہوں۔ کہ وہ اس مضمون کا سب سے دلچسپ حصہ ہے۔

سیٹھ دیاس اپنی فلم کی شوٹنگ کر چکا تھا۔ جو سین فلمائے گئے تھے۔ ان میں نور جہاں نہیں تھی۔ یعنی دوسرے الفاظ میں شوکت اور نور جہاں کی ابھی تک صحیح معنوں میں ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ایک رات نوٹس بورڈ پر یہ اعلان چپاں ہو گیا کہ نور جہاں سیٹ پر آ رہی ہے۔ اس کو باضابطہ طور پر کمپنی کی طرف سے مطلع کر دیا گیا تھا۔

اسی رات کو میں گھومتا گھامتا شیواجی پارک میں رفیق غزنوی کے پاس چلا گیا۔ اس مشہور نغمہ ساز اور موسیقار کے پاس جس کی مختلف طابیوں کی گرہوں میں مختلف قسم کے رومان بندھے ہیں۔

رفیق غزنوی میرا دوست ہے۔ میرے اس کے بڑے ہی بے تکلف مراسم ہیں۔ میں اس کے فلیٹ پر پہنچا تو محفل جمی ہوئی تھی۔ میں بے دھڑک اندر داخل ہوگیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک صوفے پر تازہ ترین ہیروئن نورشید عرف "انورادھا" بیٹھی ہے۔ اس کے ساتھ نور جہاں ہے۔ ایک کرسی پر نثری نظامی جی براجمان ہیں۔ اور فرش پر ہمارے رفیق غزنوی صاحب یوں بیٹھے ہیں جیسے کسی سومنات پر حملے کی تیاری کر رہے ہوں۔

رفیق غزنوی کے متعلق میں چند سطروں یا چند صفحات میں کچھ لکھ نہیں سکتا۔ اس کا شخص کردار اتنا وسیع ہے کہ اس پر اگر کوئی ضخیم کتاب نہیں تو ایک طویل مضمون ضرور ہونا چاہیئے۔ میں اپنے قارئین سے وعدہ کرتا ہوں کہ یہ قرض کبھی میں ایک نہ ایک دن ضرور چکا دوں گا۔

رفیق میرا دوست ہے۔ میں اگر کل کلاں موت کی آغوش میں چلا گیا اور وہ بھی کچھ دیر بعد میری طرح سو گیا تو حق رفاقت کون ادا کرے گا۔ کون اتنے بڑے موسیقار، اتنے بڑے دلچسپ کردار کی داستان حیات بیان کرے گا۔ انشاء اللہ یہ میں کروں گا مگر وقت آنے پر۔

خیر، یہ جملہ معترضہ تھا۔۔۔ رفیق۔۔۔ سومنات پر اپنے تازہ ترین حملے کی تیاری کر رہا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ نظامی اس سے غافل تھا۔ یا نہیں۔ یا نور جہاں کو اس کے ارادوں کا علم تھا۔ یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

مجھے نظامی سے اتنا معلوم ہوا کہ ممتاز (شانتی) ابھی آنے ہی
والی ہے۔ میں حیران تھا کہ ادھر شوٹنگ ہونے والی ہے۔ ادھر
اسکاچ کے دَور چل رہے ہیں۔ نظامی کے ہاتھ میں گلاس تھا۔
نورجہاں بھی ہولے ہولے خوشرنگ مشروب اپنے ہونٹوں
سے چوس رہی تھی۔ خورشید عرف انورا دھا تو خیر پختہ کار شرابیوں
کی طرح گھونٹ بھرتی تھی۔ اور رفیق — غزنہ کا رفیق۔ اس غزنہ کا
جس نے محمودؔ پیدا کیا تھا اور جو ایک ایازؔ کی محبت میں گرفتار تھا۔
گلاس زمین پر رکھے میراثیوں کے بیٹیے سُنا رہا تھا۔

میں جب اندر داخل ہوا تو اس نے حسب عادت استقبال کے
طور پر ایک بھاری بھرکم گالی اپنے منہ سے اُگلی۔ لیکن پھر فوراً ہی
شرابیانہ لب و لہجہ اختیار کر کے مجھ سے کہا۔ "جانتے ہو ان کو؟"
میں نے جواب دیا "جانتا ہوں"

رفیق چار پگ پینے کے بعد عام طور پر شرابی ہو جاتا ہے۔
لکنت بھرے لہجے میں اس نے مجھ سے کہا۔ "نہیں! تم کچھ نہیں
جانتے منٹو — یہ نورؔ ہے — نورجہاں ہے۔ سرورِجاں ہے۔
خدا کی قسم! ایسی آواز پائی ہے کہ بہشت میں خوش الحان سے
خوش الحان حُور بھی سنے تو اُسے سیند ورکھلانے کے لیے
زمین پر اتر آئے"

میں جانتا تھا کہ وہ تعریف کے یہ پُل کیوں باندھ رہا تھا۔
دراصل ان پلوں کے ذریعے ہی وہ نورجہاں کے جسم تک پہنچنا

چاہتا تھا۔ مگر میں نے دیکھا کہ نورجہاں کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی، وہ رفیق کی یہ باتیں سنتی تھی اور اسے خوش کرنے کے لیے ایک مصنوعی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر پیدا کرلیتی تھی۔

رفیق اول درجے کا کنجوس ہے۔ مگر اس دن اس نے غیر معمولی فیاضی کا مظاہرہ کیا۔ بوتل میں سے میرے لیے ایک بہت بڑا پگ عنایت کیا اور اصرار کیا کہ میں اسے ایک ہی جرعے میں ختم کر دوں۔ تاکہ ایک دوسرا بھی رہے۔

سب پی رہے تھے۔ نورجہاں کا پگ بہت ہلکا تھا جسے وہ آہستہ آہستہ ہونٹوں کے ذریعے چوس رہی تھی، جیسے مکھیاں پھولوں سے آہستہ اور ہولے ہولے رس چوستی ہیں۔

رفیق، نورجہاں کی تعریف و توصیف کے مزید پل باندھ رہا تھا کیونکہ پہلے پل سب ٹوٹ گئے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

خورشید عرف انورادھا نے اپنے دبلے پتلے مگر خوبصورت ہاتھ سے ٹیلی فون کا چونگا اٹھایا اور کان کے ذریعے سے دوسری طرف کی آواز سنی اور سٹپٹا سی گئی۔ فوراً چونگے کا منہ بند کرکے نورجہان سے مخاطب ہوئی۔ "سیٹھ ویاس ہیں۔"

نظامی نے کسی قسم کی پریشانی کا اظہار نہ کیا اور کہا۔ "بیٹا! کہہ دو کہ نورجہاں ان کے یہاں نہیں ہے۔"

خورشید عرف انورادھا نے سیٹھ ویاس سے مناسب و

موزوں الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ یہاں نہیں ہے۔"

جب ٹیلی فون کا سلسلہ ختم ہوا تو رفیق نے خورشید سے کہا۔ "شیداں ــــ! جاؤ، اندر سے ہارمونیم لاؤ ــــ سیٹھ دیاس جائے جہنّم میں۔"

شیداں اندر گئی اور ہارمونیم کی پیٹی لے آئی۔ رفیق نے اس کو کھولا۔ اس کا ڈھکنا اٹھایا اور ہوا بھر کے اپنے مخصوص انداز میں ایک سُر چھیڑا اور خود ہی جھومنے لگا۔ "ہائے ـــ سبحان اللہ! ــــ واہ!"

دیر تک وہ باجے کے مختلف سُروں کو چھیڑ کر "ہائے، سبحان اللہ، اور واہ واہ" کرتا رہا ــــ میرا خیال ہے رفیق پر علامہ اقبال کا یہ مصرعہ صادق آتا ہے ؎

دیتے ہیں سرُور اوّل، لاتے ہیں شراب آخر

گانے سے پہلے ہی رفیق سامعین پر وجد طاری کر دینے کا عادی ہے۔ مگر اس دن وہ نہ گایا۔ اس لیے کہ اس کی ساری توجہ نور جہاں پر تھی۔ ایک سُر چھیڑ کر اس نے مخمور آنکھوں سے نور جہاں کی طرف دیکھا اور درخواست کی۔ "نورؔ ــــ بس ہو جائے کوئی چیز ــــ ہائے کتنا پیارا اور مدھر سُر ہے ــــ چلو گاؤ ــــ"

آپ پردے پر ایکٹر، ایکٹرسوں کے ڈرامے دیکھتے ہیں اور ان کی کردار نگاری سے متاثر ہوتے ہیں ــ میں آپ کو اس ڈرامے کی ایک جھلک دکھاتا ہوں ۔ جو اس روز وہاں کھیلا گیا ــــ جیتے جاگتے

سو فیصدی حقیقی ڈرامے کی جھلک۔

نورجہاں نے ہارمونیم صوفے پر رکھ لیا۔ اس کے پاس خورشید عرف انوراد ھا وسکی کا گلاس ہاتھ میں لیے بیٹھی ہے۔ رفیق غزنوی قالین پر آلتی پالتی مارے نورجہاں کی طرف اپنی عشق پیشہ آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ اور گانا سننے سے پہلے ہی جھوم رہا ہے۔ دائیں ہاتھ کرسی پر سری نظامی جی براجمان ہیں۔ اور ان کے ساتھ ہی خاکسار ہے جو اپنا دوسرا اگ پی رہا ہے؟

نورجہاں گانا شروع کرتی ہے۔ غالباً پیلو کی ٹھمری ہے۔ ؎

تورے نین کا جوبن کارے

کہ ایک موٹر ہوٹے سے پورچ میں رکتی ہے۔ ایک صاحب اس کے اندر سے نکلتے ہیں اور سیدھے اندر چلے آتے ہیں —— یہ سیٹھ ویاس ہیں۔

ایک لحظہ کے لیے سب بوکھلا جاتے ہیں۔ مگر نظامی فوراً ہی حالات پر قابو پالیتا ہے۔ سیٹھ ویاس کی آمد سے گویا بے خبر وہ چلا کر خورشید سے کہتا ہے۔ "بیٹیا! یہ کیا ظلم کر رہی ہو تم —— اسے اتنی تکلیف ہے اور تم اسے گانے پہ مجبور کر رہی ہو۔ دیکھو! ایک بول گانے کے بعد اس کا کیا حال ہو گیا ہے۔

پھر وہ نورجہاں سے تشویش بھری آواز میں کہتا ہے " لیٹ جاؤ نورجہاں —— لیٹ جاؤ۔" اور وہ آگے بڑھ کر اسے لٹا دیتا ہے نورجہاں زور زور سے کراہنا شروع کر دیتی ہے۔ رفیق بھی اٹھ

کر انتہائی تشویش کا اظہار کرتا ہے۔ نظامی خورشید سے مخاطب ہوتا ہے، کسی قدر تیز لہجے میں۔ " شبداں! اٹھ، بیٹھی کیا سوچ رہی ہے۔ جا جلدی سے گرم پانی کی بوتل لا۔ بڑے زور کا دورہ پڑا ہے "

شبداں اٹھ کر تیز تیز قدم اندر چلی جاتی ہے۔ نظامی کراہتی ہوئی نور جہاں کو پچکارتا ہے، پھر سیٹھ دیاس سے مخاطب ہوتا ہے۔ " بھائی جان! ——— دہ ——— دہ تکلیف ہے۔ وہی جو عورتوں کو ہوا کرتی ہے۔ "

سیٹھ دیاس خاموش رہتا ہے۔ میں بھی دم بخود ہوں۔ نظامی ایک بار پھر کراہتی ہوئی، دوہری ہوتی ہوئی نور جہاں کو پچکارتا ہے اور سیٹھ دیاس کے پاس بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے۔ " کل سے غریب درد کے مارے پیچ و تاب کھا رہی ہے۔۔ مجھ سے کہتی تھی۔ چچا جان! مجھ سے شوٹنگ نہ ہو سکے گی۔ پر میں نے کہا۔ نہیں بیٹا! یہ بُرا شگون ہے۔ یہاں بمبئی میں یہ تمہاری پہلی پکچر ہے اور پھر شوٹنگ کا پہلا دن ——— یہ بھی چھوڑو، سیٹھ دیاس مجھے اپنا بھائی کہہ چکا ہے ——— تم مر جاؤ مگر ضرور جاؤ ——— چنانچہ ہم اسی لیے یہاں آئے تھے کہ رفیق سے تھوڑی سی برانڈی لیں اور اس کی کار لے کر اسٹوڈیو پہنچ جائیں۔ آپ کچھ فکر نہ کریں۔ آپ کا نقصان میرا نقصان ہے۔ نور جہاں ابھی پہنچتی ہے۔ ——— آپ میرے بھائی ہیں۔

سیٹھ ویاس خاموش رہا۔ نظامی کے سوا اور سب خاموش تھے۔ رفیق غزنوی دانتوں سے اپنے ناخن کاٹ رہا تھا۔ میں گلاس ہاتھ میں جیسے سوچ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے؟ کہانی میری تھی۔ میوزک رفیق غزنوی دے رہا تھا۔ اور سیٹھ ویاس، ہمارا آقا، عین موقعہ پہ پہنچ گیا تھا۔ جبکہ ہم رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ رنگ رلیاں ہی تو تھیں۔ اور کیا تھا۔ وسکی کا دور چل رہا تھا اور نور جہاں گا رہی تھی

تورے نین کا جوبن کا رے

اچھا خاصا مجرا ہو رہا تھا۔

نظامی نے اپنے مخصوص انداز میں سیٹھ ویاس سے کچھ اور باتیں کیں اور اسے یقین دلایا کہ جب دونوں ہی ایک دوسرے کو بھائی کہہ چکے ہیں تو دلوں میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہونی چاہیئے۔

اتنے میں خورشید گرم پانی کی بوتل لے کر آ گئی۔ جو نور جہاں کے پیٹ پر رکھ دی گئی۔ اس سے اس کو کچھ سکون ہوا۔ اس پر نظامی نے سیٹھ ویاس سے جو ابوالہول بنا بیٹھا تھا، کہا۔

"آپ تشریف لے چلئے، میں اور رفیق نور جہاں کو ساتھ لے کر ابھی آتے ہیں۔"

پھر اس نے اپنے آپ سے کہا۔ "میرا خیال ہے، خورشید بھی ساتھ چلے۔ عورتیں عورتوں کے سب معاملات جانتی ہیں۔"

سیٹھ ویاس اٹھا اور اپنی ٹوپی ٹھیک کرتا ہوا چلا گیا ـــ
سب کی جان میں جان آئی. نورجہاں نے اپنے پیٹ سے گرم پانی کی بوتل الگ کی، جو ٹھنڈے پانی سے بھری ہوئی تھی اور نظامی سے کہا۔ "نظامی چچا! آپ نے تو کہا تھا۔ مت جانا"،

نظامی سنجیدہ ہو گیا ــ "بیٹا! وہ میں نے تمہارے بھلے کے لیے ہی کہا تھا۔ پہلے ہی دن آدمی شوٹنگ پر چلا جائے اور پروڈیوسر کو پھیرے نہ کرائے تو وہ سر پر سوار ہو جاتا ہے۔ اپنی ممتاز سے پوچھو، جب تک سٹوڈیو سے گاڑی نہ آئے، مجال ہے جو وہ شوٹنگ میں جائے۔ اور پھر جب گاڑی بھی آتی ہے تو میں اسے کم از کم ایک گھنٹہ نیچے کھڑی رکھتا ہوں ـــ رائے بہادر چونی لال میرے اتنے دوست ہیں مگر میں ان کی بھی پروا نہیں کرتا ـــ بعض دفعہ تو ایسا بھی ہوا کہ وہ خود اپنی گاڑی میں ممتاز کو لینے آئے۔ بہرحال اب سب ٹھیک ہے۔ خود آیا ہے یہاں چل کر، اور پھر تم بیمار ہو اور بیماری کی حالت میں جا رہی ہو ـــ سیٹھ ویاس کو اس کا خیال رہے گا۔"

نظامی نے کچھ دیر اور پروڈیوسر اور آرٹسٹ کے باہمی رشتے کی باریکیاں بیان کیں اور وہ تمام گُر بتائے جو آرٹسٹ کو استعمال کرنے چاہئیں۔ اس کے بعد گفتگو آہستہ آہستہ شوکت حسین رضوی میں تحلیل ہو گئی۔ نظامی اپنی باتوں سے زبردستی نور جہاں کے دل و دماغ میں یہ خیال ٹھونسنا چاہتا تھا کہ اب اس کو

اس شخص سے کوئی سروکار نہیں۔ اس کے دل میں اب اس کے لیے کوئی جگہ نہیں اور یہ کہ اسے وہی راستہ اختیار کرنا چاہیئے جس پر ممتاز شانتی اس کی ہدایات کے مطابق اتنے عرصے سے چل رہی ہے اور اتنا نام اور روپیہ پیدا کر چکی ہے۔

اس گفتگو میں مجھے بھی حصہ لینا پڑا کہ شوکت سے میری اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی اور وہ اس بات کا اقرار بھی کر چکا تھا کہ اسے نور جہاں سے محبّت ہے۔ اور مرزا مشرف سے جو اس کا سلسلہ جاری تھا، اس سے تو قطعی طور پر یہ ثابت ہوتا تھا کہ وہ دوسری عورتوں کی آغوش میں نور جہاں کی یاد کو دفن کرنا چاہتا ہے۔ اور ہرن مارکہ جیسی تھرڈ کلاس وسکی سے اپنا غم غلط کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اصلاً شوکت گھڑی ساز تھا اور اپنے فن میں مہارتِ تامہ رکھتا تھا۔ اس لیے وہ ہر شے کی نوک پلک درست کرتا رہتا تھا۔ اس کی طبیعت کسی اکھڑے ہوئے پُرزے کسی ٹیڑھی کیل، کسی غلط وقت دینے والی گھڑی، کپڑے میں کسی شکن اور سلوٹ کو برداشت نہیں کرسکتی۔ اس کی جبلّت میں ایک نظم ہے۔ وہی نظم جو ایک اچھی گھڑی میں ہوتا ہے۔ مگر یہاں نور جہاں کے معاملے میں وہ خود کو بے بس سمجھتا ہے۔ وہ اس گھڑی کے کل پرزے کیسے درست کر سکتا تھا۔

جس کو دل کہتے ہیں۔ اگر یہ کوئی ایسی چیز ہوتی جسے وہ اپنے سامنے رکھ کر محدّب شیشے میں دیکھ سکتا۔ اس کی بال کھال اور اس کی گراریوں کا مطالعہ کر سکتا۔ تو یقیناً وہ پیچ کش لے کر اسے سب کا سب کھول دیتا۔ جو گڑبڑ پیدا ہونے کا موجب ہو رہی تھیں۔ مگر یہ دل کا معاملہ تھا۔

ادھر نورجہاں بھی جو اپنے گلے سے باریک سے باریک سُر کی نکال سکتی تھی، حیران تھی کہ اپنے دل سے شوکت کی یاد کیسے نکالے۔ وہ خیال بڑے بڑے استادوں کی طرح گا سکتی تھی۔ مگر ایک خیال اس کے دل و دماغ پہ ہر وقت چھایا رہتا تھا: اور یہ خیال اس کے محبوب کا تھا۔ بانکے چھبیلے شوکت کا۔ جس نے اس کی زندگی کو بہترین لذّت بخشی تھی۔ جس نے اس کے بدن میں وہ حرارت پیدا کی تھی جو موسیقی جیسی لطیف چیز بھی پیدا نہیں کر سکتی۔ وہ اُسے کیسے بھول سکتی تھی۔ وہ جو اس کے جسم میں ایک عرصہ تک ڈبکیاں لگاتا رہا تھا۔

شوکت کے متعلق گفتگو شروع ہوئی اور نورجہاں نے اوپرے دل سے اس کے متعلق اپنی نفرت کا اظہار کیا تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے اس سے کہا،

"نورجہاں! یہ سب بکواس ہے۔ جو کچھ تم نے کہا ہے۔ خدا کی قسم وہ تمہارے دل سے نہیں نکلا اور جو کچھ میں اس

خرزاد شوکت سے سنتا ہوں۔ خدا کی قسم! وہ بھی قطعاً جھوٹ ہوتا ہے۔ تم دونوں ایک دوسرے پر مرتے ہو۔ مگر دونوں ہی خود فریب ہو ــــ ابھی کل مصتوہ کے دفتر میں تمہاری باتیں ہو رہی تھیں۔ اور ــــ کل شام کیا۔ ہر شام جب میں اور شوکت پینا شروع کرتے ہیں تو وہ کسی نہ کسی حیلے تمہاری بات چھیڑ دیتا ہے۔ پھر خود ہی کہتا ہے کہ اس کی بات نہ کرو۔ یہی حال تمہارا ہے۔ میں نے تمہاری یاد میں اس کی آنکھوں میں آنسو بھی دیکھے ہیں اور میں تمہیں یہ بھی بتا دوں تو کہ وہ اگر تم سے دور رہا، تو وہ اپنی جوانی اور اپنی صحت تباہ کر دے گا۔ وہ تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا معلوم نہیں۔ تم نے اس پر کیا جادو پھونک رکھا ہے۔"

نورجہاں پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔

میں نے پھر کہنا شروع کیا: "نورجہاں! خودفریبی سے کام نہ لو۔ میں مانتا ہوں کہ نظامی صاحب بڑے جہاندیدہ آدمی ہیں۔ لیکن عشق و محبت میں وہ گر کبھی نہیں چلتے، جو زندگی کے دوسرے بازاروں میں چلتے ہیں۔ یہ کھوٹے سکے ہیں۔" میں ایک دم نظامی سے مخاطب ہوا: "کیوں نظامی صاحب! کیا یہ جھوٹ ہے۔"

نظامی صاحب کچھ ایسے میری تقریر میں گم تھے کہ انھوں نے جب نفی میں اپنا سر ہلایا تو انھیں مطلق اس کا احساس نہیں

تھا۔ پھر جب ایک دھچکے کے ساتھ انہیں اپنی غلطی کا احساس
ہوا تو میں بہت آگے نکل چکا تھا۔ میں نور جہاں سے جس
کی آنکھوں میں اب آنسو تیر رہے تھے، کہہ رہا تھا، وہ تم
دونوں بے وقوف ہو۔ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو
مگر اسے چھپائے پھرتے ہو۔ کس سے ؟ — کن سے ! —
— یہ دنیا تو معاف کرنا نور جہاں، کسی کو بھی محبت کرتے
نہیں دیکھ سکتی۔ — لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ
لوگ محبت کرنا ہی چھوڑ دیں۔ — ممتاز شانتی کی
زندگی واقعی قابل رشک ہے۔ نظامی صاحب جیسے شفیق
اور ہوشیار چچا کی سرپرستی میں وہ یقیناً خدا کے فضل و کرم
سے اور بھی ترقی کرے گی۔ لیکن — (یہاں میں پھر نظامی
سے مخاطب ہوا) ” لیکن نظامی صاحب! آپ سے یہ مخفی
نہیں ہوگا کہ ہر آدمی کے لیے ایک ہی چھا کام نہیں دے
سکتا۔ آپ نے جو ہدایات ممتاز کے لیے سوچی تھیں،
ظاہر ہے کہ وہ نور جہاں کے لیے کارآمد نہیں ہو سکتیں۔
دونوں کے مزاج میں زمین و آسمان کا فرق ہے —
کیا میں جھوٹ کہتا ہوں ؟ “

میں اب نظامی کو اس مقام پر لے آیا تھا جہاں وہ میری
کوئی بات جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ میں نے موقعہ غنیمت جانا
اور بولتا چلا گیا۔ میں نے نور جہاں کے دل و دماغ پر جو کہ

اس کے بیلے غالباً پہلے ہی سے تیار تھا، یہ حقیقت اچھی طرح فرقسم کردی کہ وہ اور شوکت ایک دوسرے کے بیلے بنے ہیں اور یہ جو خود فریبی سے کام لے رہے ہیں، بڑی مہلک چیز ہے۔

نظامی جب اٹھا تو وہ کوئی خوش آدمی نہیں تھا (اس جلنے میں انگریزی پن ہے مگر یہ مجھے پسند ہے) مگر اپنی فطرت سے مجبور وہ مجھ سے روکھے پن کا اظہار نہ کرسکتا تھا۔ چنانچہ اس نے نور جہاں سے یہ کہہ کر کہ وہ ٹھنڈی بوتل کی بجائے گرم بوتل لے کر خورشید کے ساتھ سٹوڈیو چلی جائے اور وہاں وقتاً فوقتاً درد کا بہانہ کرتی رہے۔ تو اس نے بڑی خندہ پیشانی سے مجھ سے گفتگو کی اور مجھے یقین دلایا کہ میرے فلیٹ اور فرنیچر وغیرہ کا مکمل بندوبست کر رکھا ہے۔ اس کو حیرت تھی کہ میں اتنے دنوں کہاں غائب رہا۔ فلیٹ کی چابی اس کے مینجر کے پاس تھی اور وہ میرا منتظر تھا۔ بلیک مارکیٹ سے پٹرول حاصل کرنے کے بیلے بھی انھوں نے ویسا ہی مکمل انتظام کر چھوڑا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی دلی خواہش تھی کہ میں ان کی دعوت قبول کروں جس میں وہ میری تواضع علاوہ مرغوں کے "جونی واکر کی بلیک لیبل" سے کریں گے۔

میں نے مناسب و موزوں الفاظ میں اس کا شکریہ ادا کیا، لیکن وہ مصر تھا کہ میں ضرور اس کی دعوت قبول کروں۔

چنانچہ میں نے قبول کر لی۔ مگر مجھے یقین تھا کہ اگر میں اس کے ہاں چلا بھی گیا تو مرغ اور جونی واکر بلیک لیبل کا ذکر تک بھی نہیں ہوگا۔

خیر ـــــ! نظامی صاحب کو چھوڑیئے کہ وہ نظامی صاحب ہیں ـــــ معلوم نہیں کس رعایت سے۔ ممکن ہے۔ حسن نظامی دہلوی کے مرید ہوں یا خود ساختہ نظامی ہوں۔ مجھے صرف یہ بتانا ہے کہ میری اس شام کی تقریباً تمام گفتگو نے نظامی کے تمام پلان درہم برہم کر دیئے۔

مجھے معلوم ہوا کہ نور جہاں اب کمال امروہی سے کوئی دلچسپی نہیں لیتی۔ اس کے ٹیلی فون آتے ہیں۔ مگر وہ کوئی جواب نہیں دیتی۔ وہ اپنی سیکنڈ ہینڈ کار لے کر آتا ہے۔ مگر وہ کسی کمرے میں چھپ جاتی ہے اور نظامی کی ہدایات کے مطابق عمل نہیں کرتی۔

ان تمام باتوں کی رپورٹ میرے ذریعے سے شوکت تک پہنچ جاتی تھی۔ ہمیں اس بات کا کامل احساس تھا کہ وہ مردِ تسمہ پا نظامی کے شکنجے میں ہے اور اس کا وہاں سے نکلنا مشکل ہے۔ چنانچہ ہم نے ایک کانفرنس کی۔ جس میں نذیر لدھیانوی ایڈیٹر "ویکلی"، میں اور شوکت شامل تھے۔ طے ہوا کہ وہیں یعنی کیڈل روڈ پر کوئی مکان حاصل کیا جائے۔

نذیر لدھیانوی کی کوششوں سے کیڈل روڈ پر ساحلِ سمندر

کے بالکل قریب گراؤنڈ فلور پر ایک نہایت عمدہ فلیٹ مل گیا، جس میں تین غسل خانے تھے۔ کئی کمرے تھے اور ایک وسیع وعریض ڈرائنگ روم تھا۔

نذیر نے جو کہ ۱۷ اڈلفی چیمبرز جیسے واہیات فلیٹ میں رہتے رہتے اکتا گیا تھا۔ شوکت سے کہا کہ وہ شرکت کرنے کے لیے تیار ہے۔ دونوں اکٹھے رہیں گے۔ چنانچہ فوراً فلیٹ حاصل کر لیا گیا۔ کرایہ غالباً ایک سو پچھتر روپے یا دو سو روپے ماہوار تھا۔ فرنیچر اور دوسرے ساز و سامان سے چند دن کے اندر اندر یہ جہازی فلیٹ سجا دیا گیا۔ شوکت کا بیڈ روم سمندر کی طرف تھا۔

ادھر سے اگر پانچ سو قدم کا فاصلہ طے کیا جاتا تو نظامی کا فلیٹ آتا تھا۔ مطلب یہ کہ اب نور جہاں اور شوکت میں صرف اتنے ہی قدموں کا فاصلہ باقی رہ گیا تھا۔

میرے ذمے جو کام تفویض کیا گیا تھا، وہ میں خوش اسلوبی سے نبھا رہا تھا۔ کبھی کبھی نظامی کے ہاں جا نکلتا تھا۔ اور اگر نور جہاں موجود ہوتی تو اس کو بتا دیتا تھا کہ شوکت نے کتنی آہیں اس کے لیے بھری ہیں اور رات کو پینے کے بعد وہ کتنی مرتبہ اس کے فراق میں رویا ہے۔

نور جہاں کو میرے ذریعے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ شوکت اس کے پڑوس میں مقیم ہے اور یہ کہ صرف پانچ سو

قدم ساحل کے ساتھ چل کر وہ اس کے پاس پہنچ سکتی ہے، یا وہ اس کے پاس ـــــ بیر کی سیر اور دیدار یار بھی۔

میں نے کئی دفعہ محسوس کیا کہ یہ کام جو میں کر رہا ہوں کسی بوڑھی کٹنی کا ہے۔ مگر دوست کے لیے آدمی کیا کچھ نہیں کرتا ـــــ؟

یہاں میں آپ پر یہ واضح کردوں کہ میں دونوں کی شادی کے سخت خلاف تھا۔ ایکٹرس سے شادی کا سلسلہ ہی میرے نزدیک غلط بات ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہیں، بس ٹھیک ہے۔ جب اُکتا جائیں تو اپنا اپنا راستہ لیں ـــــ مگر شوکت پٹہ لکھوانے کا قائل تھا کہ زمین ساری عمر اُسی کی ملکیت رہے۔ میں نے اُسے بہت سمجھایا۔ وہ مان گیا۔ کہ اگر نورجہاں سے اس کا ملاپ ہو گیا تو وہ شادی نہیں کرے گا۔

مجھے جو کرنا تھا، کر چکا تھا۔ میں اب اپنی کہانی کا جس کا عنوان "نوکر" تجویز ہوا تھا، منظر نامہ لکھنے میں بے طرح مصروف تھا۔ اس کے علاوہ کیڈل روڈ اور ہائی کلہ میں کئی میل حائل تھے، اس لیے شوکت کے ہاں میرا آنا جانا کم ہو گیا۔

ان دنوں اچھی بیئر نایاب تھی۔ اتفاق سے امریکی بیئر کی چار فربہ اندام بوتلیں مجھے مل گئیں۔ میں یہ ساتھ لے کر

کیتھڈرل روڈ پہنچا۔ صبح کا وقت تھا۔ میں چاہتا تھا کہ یہ مشروب ناشتے ہی سے شروع کیا جائے۔

جب وہاں پہنچا تو دیکھا کہ فلیٹ سنسان ہے۔ نذیر لدھیانوی نہا دھوکر اور ناشتہ کرکے دفتر روانہ ہو چکا ہے اور شوکت سو رہا ہے۔

میں اس کی خوابگاہ کے پاس پہنچا اور دستک دی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ پھر ذرا زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے شوکت کی خواب آلود آواز آئی۔ "کون ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "منٹو"

شوکت نے کہا۔ "ٹھہرو!"

میں ٹھہرا رہا۔ تین منٹ کے بعد دروازہ کھلا۔ کمرے کے اکلوتے پلنگ پر نورجہاں لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے اس کو دیکھتے ہی نعرہ لگایا۔ "انقلاب زندہ باد"

نورجہاں کی آنکھیں ایسے معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی وہ لانڈری سے دھل کے آئی ہیں۔ میں نے شوکت کو دیکھا کہ وہ کسی قدر مضمحل تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "تو چتوڑ گڑھ فتح ہو گیا"

شوکت مسکرا دیا۔ اس کی یہ مسکراہٹ اطمینان بھری تھی۔ کہنے لگا۔ "آؤ بیٹھو!"

میں ان کے پلنگ کے پاس ڈریسنگ ٹیبل کے اسٹول پر

بیٹھ گیا اور شوکت سے مخاطب ہوا ــ "کیوں بھائی! یہ محترمہ کیسے تشریف لائیں؟"

شوکت نے فاتحانہ نظروں سے نور جہاں کو دیکھا جو پلنگ پر چادر سے خود کو اچھی طرح ڈھانپ رہی تھی "بس کچے دھاگے سے بندھی آئی ہیں۔"

معلوم نہیں وہ کچے دھاگے سے بندھی آئی تھی یا پکے دھاگے سے بندھی آئی تھی۔ پر میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ وہ دھاگہ جیسا بھی تھا اس کی تخلیق ہاتھوں سے نہیں، دلوں سے ہوئی تھی۔ بڑے عمدہ طریقے سے بٹا ہوا تھا۔ ورنہ وہ پانچ سو قدموں کا فاصلہ اتنی جلدی اور اتنی خوبی سے پاٹا نہیں جا سکتا تھا۔

قصہ مختصر یہ کہ شوکت کے بیڈ روم میں جس فرنیچر کی کمی تھی۔ وہ پوری ہوگئی تھی۔ــ اور اب وہ مکمل طور پر سج گیا تھا۔ لیکن ادھر نظامی کے فلیٹ میں ایک بتی بجھ گئی تھی۔ وہ بتی جو ایک پورے بجلی گھر میں تبدیل ہوسکتی تھی۔

نظامی نے اسے بہت سمجھایا بجھایا، بھائیوں نے اسے بہت دھمکیاں دیں، پر جب عشق کا بھوت سر پر سوار ہوا تو کانوں کے سارے دروازے بند ہوجاتے ہیں۔ دھمکیاں اور بھبکیاں، پند و نصائح قطعاً اثر انداز نہیں ہوتے۔

شوکت نے مجھ سے کہا۔ "منٹو! میرا خیال ہے، میں سالی

سے شادی کر ڈالوں۔"

میں نے پھر اس سے کہا: " یہ تمہاری مرضی ہے کہ تم اس کے مالک ہو، لیکن میری ایمان دارانہ رائے یہی ہے کہ تمہارا یہ اقدام درست نہیں ہوگا۔ کیا تم نے اس بارے میں اپنے گھر والوں سے مشورہ کیا ہے؟

اس سوال کا جواب شوکت گول کر گیا۔ بہرحال اب مجھے یقین تھا کہ وہ اب سوچ سمجھ کر قدم اُٹھائے گا اور عجلت سے کام نہ لے گا۔

بمبئی میں ایک بزرگ حکیم ابو محمد طاہر اشک عظیم آبادی کے نام سے تھے۔ یہ ایک عجیب شے تھے۔ عمر آپ کی پچھتر برس کے قریب تھی، مگر دل جوان تھا۔ آنکھوں کی بینائی بالکل درست تھی۔ دانت سلامت تھے۔ ہر نئے فلم کا پہلا شو دیکھتے تھے۔ پانچ زبانیں بولتے تھے۔ اردو، فارسی، عربی انگریزی اور پنجابی۔ بڑے معرکے کے آدمی تھے۔ طبابت سے شغف تھا اور شعر و شاعری سے بھی۔ شوکت سے میں نے ان کی ملاقات کرائی تو وہ ان کے گرویدہ ہوگئے۔ اور ان کو چچا جان کہنے لگے۔

حکیم صاحب نے ان سے دور دراز کا کوئی رشتہ بھی پیدا کر لیا تھا۔ اُن کے کہنے کے مطابق وہ شوکت کے خاندان سے بہت پرانے مراسم رکھتے تھے۔

ہاں میرا آنا جانا بہت کم ہو گیا تھا۔ اس لیے کہ بائی کلہ اور کیڈل روڈ میں فاصلہ کافی تھا۔ اس کے علاوہ میں کہانی کی منظر نویسی میں مشغول تھا۔ چند دن گزرے تو حکیم صاحب تشریف لائے۔ مجھے ان سے بڑی عقیدت تھی کہ میری زبان درست کرنے میں آپ نے غیر شعوری طور پر میری بہت مدد کی تھی۔ ان کو بھی مجھ سے محبت تھی۔ کہ میں ان کی خدمت کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا۔ باتوں باتوں میں آپ نے مجھے بتایا کہ شوکت بیٹے کا نکاح نور جہاں سے ہو گیا ہے۔ میں بہت حیران تھا کہ مجھے اس کی خبر تک نہ ہوئی۔

جب میں نے اپنی حیرت کا اظہار کیا تو حکیم صاحب نے سارا معاملہ گول کرنے کی کوشش کی۔ جب ناکام رہے تو انھوں نے مجھ سے کہا۔ "دیکھو سعادت! یہ سب کچھ خفیہ طور پر ہوا ہے تاکہ لوگوں میں چرچا نہ ہو۔ میں نے تم سے ذکر کر دیا کہ تم بھی شوکت کی طرح میرے بیٹے ہو، اس لیے یہ راز راز ہی رہے۔"

یہ راز کب تک راز رہ سکتا تھا؟ میں پچھتر برس کے بڈھے سے کیا بحث کرتا! غصہ تو مجھے صرف اس بات کا تھا کہ شوکت نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائے رکھی؟ اگر اسے نکاح کرنا ہی تھا تو میری شمولیت اس میں کیوں ضروری نہ سمجھی؟ جیسا کہ میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں، شوکت کے

اور مجھے کیوں تاش کی گڈی میں سے جوکر سمجھ کر الگ کر دیا گیا۔
—— میرے دل میں تکدّر تھا، لیکن شوکت سے میں نے اس کا ذکر نہ کیا کہ اس سے میرے اور اس کے تعلقات یقیناً کشیدہ ہو جاتے۔

دن گزرتے گئے۔

نظامی تھک ہار کر بیٹھ گیا۔ سیّد کمال حیدر امروہوی نے ہزار ہا مرتبہ ٹیلی فون کیا۔ سینکڑوں مرتبہ اپنی سیکنڈ ہینڈ کار میں نظامی کے فلیٹ کے چکّر کاٹے، آخر وہ بھی نا امید ہو کر دیگر مشاغل میں مصروف ہو گیا۔

شوکت کا بیڈ روم آباد تھا۔ وہاں ہنسی کے چھینٹے اُڑتے تھے۔ نور جہاں کے گلے سے نُور برستا تھا۔ رفیق غزنوی سے جس قسم کی دُھنیں بنوائی ہوتی تھیں، ان کی ریہرسل ہوتی تھی۔ دو جوانیاں کیڈل روڈ کے اس فلیٹ میں کھُل کھیل رہی تھیں۔

میں آپ کو ایک لطیفہ سناؤں۔

میرے بھائی جان! سعید حسن بیرسٹر، جزائر فجی سے ایک مدت کے بعد امرتسر جانے کے لیے تشریف لائے۔ انھوں نے مجھے اطلاع دی کہ وہ بذریعہ ہوائی جہاز آرہے ہیں۔ ان دنوں میں ماہِم میں رہتا تھا اور ہمارا فلیٹ بہت ہی چھوٹا تھا۔ میں نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا کہ مصوّر کے ایڈیٹر نذیر لدھیانوی بھی موجود تھے۔ طے یہ پایا کہ ان کو

اس فلیٹ میں ٹھہرایا جائے جہاں نذیر اور شوکت دونوں اکٹھے رہتے ہیں۔

یہ فلیٹ جیسا کہ میں عرض کرچکا ہوں، بہت بڑا تھا۔ نذیر چھڑا چھٹانک تھا۔ شوکت تھا، اس کی نورجہاں تھی۔ ان کو تو بس فقط ایک بیڈ روم چاہیئے تھا۔ باقی کموں سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے بھائی جان کے لیے جو یورپی طرزِ رہائش کے عادی تھے۔ ایک علیٰحدہ کمرے اور غسل خانے کا انتظام بڑی آسانی سے ہوسکتا تھا۔ چنانچہ جب وہ بمبئی تشریف لائے اور چند روز کے لیے وہاں رُکے تو میں انہیں کیڈل روڈ پر لے گیا۔

وہ یہ فلیٹ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ عمارت قریب قریب نئی تھی، جدید طرز کی، دومنزلہ تھی۔ اوپر کی منزل میں صاحبِ مکان رہتے تھے۔ پچھلی طرف یعنی جدھر سمندر کا ساحل تھا، کوئی دو سو قدم کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا بغیچہ تھا۔ اس میں بچوں کے کھیلنے کے لیے جھولے تھے اور وہ جنہیں انگریزی میں "سی سا" کہتے ہیں اور وہ پھسلنے والے تختے!

سمندر کی مرطوب ہوا ہر وقت آتی رہتی تھی۔ بعض اوقات یہ اس قدر تیز ہوجاتی تھی کہ فلیٹ کے وہ تمام دروازے، وہ تمام کھڑکیاں، جن کا رُخ سمندر کی طرف تھا، بند رکھنا پڑتی

تھیں کہ چیزیں اپنی جگہ سلامت رہیں۔

اس فلیٹ میں بھائی جان اپنے مختصر سے اسباب کے ساتھ اُترے اور بہت خوش ہوئے۔ لیکن چند ہی روز میں ایک ٹریجیڈی وقوع پذیر ہوگئی۔

شوکت نورجہاں کو دوبارہ پاکر بہت خوش تھا۔ اس خوشی کا انکاس کسی نہ کسی طرح نفسیاتی طور پر ہونا ہی چاہیئے تھا۔ پھر مرزا مشرف تھا، شوکت کی دیگ کا بہت بڑا چمچہ، چاولہ تھا سہگل تھا اور دوسرے تھے جو شوکت کے فلم میں شریک ہونے کے لیے بے قرار تھے۔

فلمی دنیا دراصل رات کی دنیا ہے۔ دن بھر یہ سب اپنے اپنے کاموں میں مشغول رہتے تھے اور سرِشام شوکت کے ہاں جمع ہو جاتے تھے۔ وسکی کے دور چلتے تھے، سوقیانہ قسم کی ہنسی ٹھٹھے ہوتے تھے۔ گانے گائے جاتے تھے۔ کہانیاں سنائی جاتی تھیں اور بعض اوقات تو اتنا شور برپا ہوتا تھا کہ اوپر کی منزل والوں کو پکار پکار کر کہنا پڑتا تھا کہ بابا خاموش رہو۔

ایک رات شوکت نے غالباً ایم۔ اے مغل کو جو پری چہرہ نسیم بانو کے ڈھنڈورچی کی حیثیت سے مشہور تھے۔ اپنے ہاں مدعو کیا۔ مرزا مشرف بھی تھے، میں بھی تھا اور میری بیوی بھی تھی۔ دعوتِ طعام سے فارغ ہو کر میں اور

میری بیوی تو فوراً چلے گئے کہ ہمیں ایک ضروری کام سے کہیں جانا تھا۔ بھائی جان شوکت علی کے بیٹے زاہد کے ہاں مدعو تھے۔ وہ دیر سے لوٹے۔ مگر جب انھوں نے ہال میں قدم رکھا تو دیکھا کہ زندی و سرمستی اپنے بال کھولے ناچ رہی ہے۔ وہ ہاو ہُو ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ معلوم نہیں، انھوں نے اور کیا کچھ دیکھا کہ صبح ہوتے ہی اپنا سامان بندھوا کر خلافت ہاؤس چلے گئے۔ اور مجھے اور میرے دوستوں کو اس قدر تند و تیز لہجے میں بُرا بھلا کہا کہ اب میں نے اس واقعہ کو یاد کیا ہے تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میرے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ اُتر رہا ہے۔

انھوں نے اصل میں اپنی ساری زندگی قانون کی کتابوں میں گزاری تھی۔ ساری عمر مقدمے لڑتے رہے تھے۔ لاہور میں، بمبئی میں، مشرقی افریقہ میں اور جزائر فجی میں۔ ان کو کیا معلوم کہ فلمی دنیا کیا ہوتی ہے؟ اور اس کے عاشق و معشوق کس قسم کے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ اور خلافت ہاؤس میں جاکر پناہ لی۔ پر لطف کی بات یہ ہے کہ یہ خلافت ہاؤس ایک ایسی گلی میں واقع ہے جس کا نام "لَو لین" ہے۔ یعنی محبت کی گلی ہے۔

یہ قصہ تو خیر ضمناً آگیا کہ زیبِ داستان کے لیے ضروری تھا۔ اب میں نورجہاں کی طرف لوٹتا ہوں۔ جس کی بڑی بہن وہیں کیڈل روڈ پر پاس ہی اپنے بھائی کے ذریعے سے پیشہ کراتی تھی مگر پرائیویٹ طور پر ــــ مجھے معلوم نہیں کہ یہ دونوں بہنیں آپس میں ملتی تھیں یا نہیں، لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں، شوکت نے اس کی اجازت نورجہاں کو کبھی نہ دی ہوگی۔

نورجہاں کا بھائی پہلے درجے کا جواری تھا۔ سٹہ کھیلتا تھا۔ تاش کے پتوں پر داؤ لگاتا تھا۔ ریسوں میں جاتا تھا۔ اس کو ظاہر ہے کہ نورجہاں اور شوکت کا ملاپ سخت شاق گزرا تھا۔ جیسا کہ میں اس سے پیشتر عرض کر چکا ہوں۔ اس نے چچا نظامی سے مل کر بہت کوشش کی کہ وہ پھر ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں اور نورجہاں ان دونوں کی روزی کا ٹھیکرہ بن جائے۔ مگر یہ بیل منڈھے نہ چڑھی۔

شوکت کو ہر قسم کی دھمکیاں دی گئیں مگر وہ بھی ایک دبنگ آدمی ہے، اس نے ان کی کوئی پروا نہ کی اور نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ یہ محاذ بالکل خاموش ہوگیا۔

فلم "نوکر" کی شوٹنگ جاری تھی۔ رفیق اس کی موسیقی مرتب کر رہا تھا۔ بظاہر وہ اپنے کام میں پورے انہماک سے دلچسپی لیتا تھا، مگر میں صاف محسوس کرتا تھا کہ رفیق غزنوی

ہر وقت الجھن سی محسوس کرتا ہے۔ اس لیے کہ اس کی عین ناک کے نیچے (یہ بھی انگریزی محاورہ ہے) ایک اور شخص اس لونڈیا کو اڑا لے گیا تھا جس پر اس کی عشق پیشہ آنکھ تھی۔

بہر حال فلم۔ نوکر، کی تکمیل افتاں وخیزاں جاری تھی۔ اس دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ شوکت فلم سازی کے معاملے میں بے حد متلون مزاج ہے۔ اس کو ایک آدمی کا کام پسند نہیں آتا۔ بلکہ یوں کہئے کہ اس کو فقط ایک آدمی کے کام سے اطمینان نہیں ہوتا۔ میں نے اس کو کہانی کا منظر نامہ مع مکالموں کے لکھ کر دے دیا تھا مگر بعد میں پتہ چلا کہ وہ خفیہ طور پر کئی آدمیوں سے مکالمے لکھوا رہا ہے۔ ان میں ہمارے بزرگ اشک عظیم آبادی بھی تھے۔ مجھے بہت تاؤ آیا۔ جہاں تک اشک صاحب کا تعلق تھا، مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا مگر دوسروں کو میں قطعاً برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے بڑے گرم الفاظ میں شوکت سے اپنی شکایت کا اظہار کیا۔ آدمی سمجھ دار ہے۔ حکمت عملی سے کام لے کر اس نے میرے دماغ پر برف کی کئی سلیں رکھ دیں۔ مگر میں دل برداشتہ ہو چکا تھا کیونکہ کہانی بھی میری مرضی کے مطابق نہیں لکھی گئی تھی۔ اور اس کے ہر کونے اور ہر موڑ پر شوکت نے اپنی

من مانی کی تقی۔
میں بڑا ہٹ دھرم اور ضدی آدمی ہوں، لیکن شوکت کے سامنے میری کوئی پیش نہ چلتی تھی۔ اس کے علاوہ میں نے چند دن اس کے ساتھ کام کرکے قطعی طور پر جان لیا تھا کہ یہ شخص جو میرے ساتھ ہرن مارکہ وسکی اور کریون اے کے سگریٹ پیتا رہا ہے اور میری ہر بات مانتا رہا ہے۔ فلم سازی کے معاملے میں وہی کچھ کرے گا جو اس کا گھڑی ساز دماغ مناسب سمجھتا ہوگا۔ چنانچہ یہی ہوا اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ دبے پاؤں فلم " نوکر " کی پروڈکشن سے باہر نکل جاؤں گا۔
میں نے ایسا ہی کیا۔ شوکت چونکہ میرے اڑیل مزاج سے واقف تھا۔ اس لیے اس نے میرے اس فرار کو سکون کے سے اچھا سمجھا۔ کیونکہ بہت ممکن تھا کہ اگر میں کسی نکتے پر اڑ جاتا تو فلم کی شوٹنگ مہینوں تک کھٹائی میں پڑی رہتی۔
مجھے اس سے شکایت تھی۔ اس کو بھی اپنی جگہ یقیناً ہوگی۔ مگر ہمارے دوستانہ تعلقات میں کوئی فرق نہ آیا۔ میں اس سے پیشتر عرض کر چکا ہوں کہ ملک میں سیاسی گڑبڑ کے باعث فلم انڈسٹری کی حالت بالکل چھوئی موئی کی سی تھی۔ کسی نے اسٹول پر چڑھ کر " انقلاب زندہ باد " کا نعرہ لگایا تو کسی فلموں کا اسقاط ہو جاتا تھا۔ یوں بھی ان دنوں جنگ کے باعث خام مال قریب قریب نایاب تھا۔ حالات چونکہ غیر یقینی

تھے۔ اس لیے بہت کم فلم ڈائرکٹروں کی مالی حالت اچھی تھی۔ یہ پروڈیوسروں کے پاس ایک گھڑا گھڑایا اور بہت معقول بہانہ موجود تھا کہ روپیہ کہاں سے لائیں؟ جنگ شروع ہے۔ آج کریٹ کی لڑائی ہے اور کل فن لینڈ کی۔ پرسوں جاپان کے حملے کا خطرہ ہے۔ مگر سچ پوچھئے تو یہی وہ زمانہ تھا کہ جب پروڈیوسروں اور سرمایہ لگانے والوں نے جھولیاں بھر بھر کے کمایا۔

شوکت کا اس دوران میں ایک اور جگہ کنٹریکٹ ہوا۔ غالباً سیٹھ نہ وہری (بمبئی میں جوہری کی بگڑی ہوئی شکل) سے۔ یہ ایک بڑا بر خود غلط قسم کا انسان تھا۔ بڑے ادنےٰ درجے سے تعلق رکھتا تھا، مگر جنگ نے اسے سیٹھ بنا دیا تھا۔ اب وہ کھل کھیلنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک فلم کمپنی کھڑی کر دی تھی۔ دو چار موٹریں لے لی تھیں۔ اونچی جگہوں پر تو اس کا ہاتھ نہ پہنچتا تھا مگر وہ ایکسٹرا لڑکیوں کو پھانسنے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔

اس سیٹھ سے شوکت کا کنٹریکٹ ہوا۔ تو اس نے تین ہزار روپے پیشگی دیئے۔ میں شوکت کے ساتھ تھا۔ جب چیک کیش ہو گیا تو میں نے روپے اس سے لے لیے اور اس سے کہا۔ "چلو! ڈاک خانے چلیں۔"

ڈاک خانے پہنچ کر میں نے وہ روپے سب کے سب ہی شوکت کے گھر رجسٹری اور بیمہ کرا کے بھیج دیئے۔ میرا خیال ہے

نورجہاں کو میری یہ حرکت یقیناً ناگوار گزری ہوگی۔ لیکن میرا اس سے کیا سروکار ؟

اسی دوران میں شوکت کو میں نے مجبور کیا کہ وہ اپنی زندگی کا بیمہ کرائے۔ وہ میری باتوں کو بہت کم رد کرتا تھا، فوراً مان گیا۔ چنانچہ دس ہزار روپے کی پالیسی لے لی گئی۔ ——

معلوم نہیں، مجھے یہ سب باتیں اور یہ تمام حرکات بزرگانہ ہونے کے بجائے طفلانہ معلوم ہوتی ہیں۔ صاف اوروں کو نصیحت اور خود میاں فضیحت والا معاملہ تھا۔

نورجہاں اب خوب نکھر گئی تھی۔ مرد کی قربت بھی عورت کے حسن کے لیے کتنی ضروری ہوتی ہے — اس کے جسم کے خطوط اب واضح شکل اختیار کر چکے تھے۔ وہ تمام خالی جگہیں جو لاہور میں پُر نہ ہوئی تھیں، یہاں بمبئی میں پُر ہو گئی تھیں۔ اور اس پر جسم کی لذتوں کے قریب قریب تمام اسرار منکشف ہو چکے تھے۔ نورجہاں گو اب بھی لوگوں کی زبان پر "بے بی نورجہاں" تھی۔ مگر وہ عشق و محبت کا جھولا جھول جھول کر ان تمام جھونٹوں سے آگاہ ہو چکی تھی جو اس کی رسیوں میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔

ایک دن آؤٹ ڈور شوٹنگ تھی۔ بمبئی کے مضافات میں کسی کا ایک خوبصورت باغ تھا۔ جس کو شوکت نے منتخب کیا تھا۔ کیمرے کے لینس کے ساتھ ریڈ فلٹر لگا کر منظر کشی کرنا تھی کہ دن کی بجائے رات معلوم ہو اور جو دھوپ ہو

تھے۔ اس پیسے بہت کم فلم ڈائرکٹروں کی مالی حالت اچھی تھی۔ یہ پروڈیوسروں کے پاس ایک گھڑا گھڑایا اور بہت معقول بہانہ موجود تھا کہ وہ پیسہ کہاں سے لائیں؟ جنگ شروع ہے۔ آج کرپٹ کی لڑائی ہے اور کل فن لینڈ کی۔ پرسوں جاپان کے حملے کا خطرہ ہے۔ مگر سچ پوچھئے تو یہی وہ زمانہ تھا کہ جب پروڈیوسروں اور سرمایہ لگانے والوں نے جھولیاں بھر بھر کے کمایا۔

شوکت کا اس دوران میں ایک اور جگہ کنٹریکٹ ہوا۔ غالباً سیٹھ نوبیری (بمبئی میں جوہری کی بگڑی ہوئی شکل) سے۔ یہ ایک بڑا بر خود غلط قسم کا انسان تھا۔ بڑے او نچے درجے سے تعلق رکھتا تھا، مگر جنگ نے اسے سیٹھ بنا دیا تھا۔ اب وہ کھل کھیلنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک فلم کمپنی کھڑی کر دی تھی۔ دو چار موٹریں لے لی تھیں۔ اونچی جگہوں پر تو اس کا ہاتھ نہ پہنچتا تھا مگر وہ ایکسٹرا لڑکیوں کو پھانسنے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔

اس سیٹھ سے شوکت کا کنٹریکٹ ہوا۔ تو اس نے تین ہزار روپے پیشگی دیئے۔ میں شوکت کے ساتھ تھا۔ جب چیک کیش ہو گیا تو میں نے روپے اس سے لے لیے اور اس سے کہا۔ "چلو! ڈاک خانے چلیں۔"

ڈاک خانے پہنچ کر میں نے وہ روپے سب کے سب ہی شوکت کے گھر رجسٹری اور بیمہ کرا کے بھیج دیئے۔ میرا خیال ہے

نورجہاں کو میری یہ حرکت یقیناً ناگوار گزری ہوگی۔ لیکن میرا اس سے کیا سروکار؟

اسی دوران میں شوکت کو میں نے مجبور کیا کہ وہ اپنی زندگی کا بیمہ کرائے۔ وہ میری باتوں کو بہت کم رد کرتا تھا، فوراً مان گیا۔ چنانچہ دس ہزار روپے کی پالیسی لے لی گئی۔ —

معلوم نہیں، مجھے یہ سب باتیں اور یہ تمام حرکات بزرگانہ ہونے کے بجائے طفلانہ معلوم ہوتی ہیں۔ صاف اوروں کو نصیحت اور خود میاں فضیحت والا معاملہ تھا۔

نورجہاں اب خوب نکھر گئی تھی۔ مرد کی قربت بھی عورت کے حسن کے لیے کتنی ضروری ہوتی ہے — اس کے جسم کے خطوط اب واضح شکل اختیار کر چکے تھے۔ وہ تمام خالی جگہیں جو لاہور میں پُر نہ ہوئی تھیں، یہاں بمبئی میں پُر ہو گئی تھیں۔ اور اس پر جسم کی لذتوں کے قریب قریب تمام اسرار منکشف ہو چکے تھے۔ نورجہاں کو اب بھی لوگوں کی زبان پر "بے بی نورجہاں" تھی۔ مگر وہ عشق و محبت کا جھولا جھول جھول کر ان تمام جھونٹوں سے آگاہ ہو چکی تھی جو اس کی رسیوں میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔

ایک دن آؤٹ ڈور شوٹنگ تھی۔ بمبئی کے مضافات میں کسی کا ایک خوبصورت باغ تھا۔ جس کو شوکت نے منتخب کیا تھا۔ کیمرے کے لینس کے ساتھ ریڈ فلٹر لگا کر منظر کشی کرنا تھی کہ دن کی بجائے رات معلوم ہو اور جو دھوپ ہو

وہ چاند نی نظر آسئے۔
شوکت نے اصرار کیا کہ میں اس کے ساتھ ضرور چلوں۔
مجھے دیر ہوگئی۔ اس لیے میں سیٹھ دیاس کی گاڑی میں وہاں پہنچا۔ نور جہاں کو میں نے کوکیبش پر دیکھا تو میری آنکھوں کو زبردست دھکا لگا۔ عجیب وغریب لباس پہنے تھی۔ لباس کی وضع قطع میرے لیے نئی نہیں تھی۔ معمولی شلوار قمیص تھی۔ مگر اس میں آنکھوں کے لیے بڑی خارش پیدا کرنے والی حدت تھی۔
شلوار جالی کی تھی۔ جسے انگریزی میں " نٹ " کہتے ہیں۔
عام طور پر یہ کپڑا کھڑکیوں کے پردوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔
معلوم نہیں یہ نور جہاں کی اپج تھی یا سید شوکت حسین رضوی کی۔
مگر وہ یہ لاکھوں کھڑکیوں والی شلوار پہنے تھی۔ جس میں اس کی ٹانگیں بغیر کسی تکلیف کے چھن چھن کے باہر آرہی تھیں۔
قمیص بھی اسی کپڑے کی تھی۔ اب آپ خود ہی اندازہ لگا لیجیے کہ اس ملبوس نے نور جہاں کو ڈھانکنے کی کتنی کوشش کی ہو گی!۔
شوبھنا سمرتھ بھی موجود تھی۔ نور جہاں کو اس لباس میں دیکھ کر واللہ میں تو بوکھلا گیا تھا۔ ایسا لباس، پھر روشنی کے پیش منظر میں۔ میں نے اپنی زخمی نگاہیں ادھر سے ہٹائیں اور شوبھنا کے پاس چلا گیا۔ کہ وہ مستور تھی۔
شوبھنا سمرتھ تعلیم یافتہ عورت ہے۔ گفتگو کا سلیقہ رکھتی ہے۔ چونکہ اچھے مرہٹی خاندان کی ہے۔ اس لیے

اس میں ہلکٹ پن (بمبئی کی زبان میں) نہیں۔ بڑی ہی باتمیز عورت ہے۔ وہ بھی اس فلم میں کام کر رہی تھی۔ میں اس کے سانتھ گھاس کے ایک تختے پر بیٹھ گیا اور اپنی وہ کوفت اور اپنا وہ تکدر دور کرتا رہا جو نورجہاں کا کھڑکیوں والا لباس دیکھ کر میرے دل و دماغ میں پیدا ہوا تھا۔

جیسا کہ میں اس سے پہلے بیان کر چکا ہوں۔ مجھے فلم "نوکر" سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ شوکت اپنی من مانی کر رہا تھا۔ اور میں اس میں دخل دینے سے کتراتا تھا کہ میرے اور اس کے تعلقات کہیں خراب نہ ہو جائیں۔

نور جہاں سے اس کے گھر میں کئی مرتبہ ملاقاتیں ہوئیں۔ میں نے اس کا جب بھی اور زیادہ غور سے مطالعہ کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ جس طبقے سے تعلق رکھتی ہے، اسی کی خصوصیات اس میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اس کی ہر ادا میں اور ہر حرکت میں ایک بناوٹی ادا تھی، ایک نخرہ تھا جسے سنجیدہ نگاہیں شاید ہی قبول کر سکیں۔

مجھے تعجب ہے، کہ سیٹھ شوکت ٹھیٹھ ہندوستانی (یعنی یو۔ پی۔ کا باشندہ) اور وہ ٹھیٹھ پنجابی، — ایک لحاظ سے جٹنی" گاؤں کی مٹیار — لیکن دونوں بہت خوش تھے۔ شوکت پنجابی نما اردو بولنے کی کوشش کرتا اور وہ اردو نما

پنجابی۔ خاصی دلچسپ چیز تھی۔

فلم "نوکر" ختم ہوئی تو شوکت اور میرے درمیان فاصلہ بڑھ گیا۔ وہ عشق کے جھوٹے جھول کر اب کاروباری دھندوں میں مشغول ہو گیا تھا، اور میں اپنے کاموں میں۔ گاہے گاہے کبھی فلم کمپنی کے دفتر میں، یا سڑک پر اس سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ مگر وہ بھی چند منٹوں کی خیر خیریت دریافت کی اور اپنی راہ لی۔

فلم انڈسٹری کی حالت اب بہتر تھی۔ جنگ کا خوف پروڈیوسروں کے سر سے اتر چکا تھا۔ اور فلم انڈسٹری کے تمام متعلقین کو معلوم ہو چکا تھا کہ یہ زمانہ کمانے کا ہے۔ چنانچہ لاکھوں روپے ادھر سے ادھر آ جا رہے تھے۔

شوکت ذہین ہونے کے علاوہ کاروباری آدمی بھی ہے۔ چنانچہ اس نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا اور کچھ عرصے کے بعد اپنی ذاتی فلم کمپنی قائم کی۔ اور ایک بڑا کامیاب فلم بنایا۔ یوں تو اس کی ساکھ پہلے ہی قائم تھی کہ فلم انڈسٹری کے لوگ اسے ایک قابل ڈائرکٹر اور ماہر اڈیٹر مانتے تھے لیکن جب اس نے اپنی ذاتی فلم کمپنی کھڑی کی تو انڈسٹری کے حلقوں میں اس کا وقار اور بھی بڑھ گیا۔

عام طور پر ڈائرکٹر یا پروڈیوسر فلمی دنیا میں کسی ایکٹرس

سے صرف اس لیے شادی کرتے ہیں کہ وہ ان کی کشتیٔ حیات میں پتوار کا کام دے۔ معلوم نہیں شوکت نے نورجہاں سے کیا اسی مقصد کے پیش نظر شادی کی تھی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر وہ اس سے شادی نہ بھی کرتا تو بھی اس کی آمدنی میں روز افزوں ترقی ہوتی رہتی۔ اس لیے کہ وہ اپنے فن کو جانتا ہے اور پھر مزدوروں کی طرح مشقت کر سکتا ہے۔

مجھے معلوم نہیں، شوکت بمبئی کو چھوڑ کر پاکستان کیوں آیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ بڑا کٹر قسم کا مسلمان ہے۔ اگر وہاں بمبئی میں کسی نے مسلمانوں کے خلاف ایک جملہ بھی کہہ دیا ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ اس کی کھوپڑی پیچ کش سے کھول دیتا اور اس کی اصلاح کرنے کی ناکام کوشش کرتا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نورجہاں نے اسے مجبور کیا ہو کہ اسے لاہور بہت پیارا ہے۔ کیونکہ پنجابیوں کے کہنے کے مطابق "لاہور لاہور ہے۔"

بمبئی میں وہ بہت کامیاب تھا۔ اس نے ایک دو فلم ایسے بنائے تھے جن سے اس کی دھاک بیٹھ گئی تھی، وہ کروڑوں روپے وہاں پیدا کر سکتا تھا۔

لیکن اس نے پاکستان کو اپنا گھر بنایا۔ اس کا گھڑی ساز دماغ جو سوئی کی ایک خفیف سی غلط حرکت کو بھی

برداشت نہیں کرسکتا۔ یہاں پاکستان کی فلم انڈسٹری کے لیے جو حالتِ نزع میں تھی، کام آیا۔

اس نے شوری کا جلا ہوا، سڑا ہوا، نہایت شکستہ، اسٹوڈیو حاصل کیا اور اسے ایک اعلےٰ ترین نگار خانے میں تبدیل کر دیا۔

آپ میں سے بہت کم حضرات جانتے ہوں گے کہ شاہ نور اسٹوڈیو میں جو بھی کیل ٹھکی ہے، اس میں شوکت حسین رضوی کا ہاتھ ہے۔ جو پیچ لگا ہے، اس پر شوکت کے پیچ کش کا نشان ہے۔ وہاں چھوٹے سے چھوٹے سے لے کر لیبارٹری کی بھاری بھرکم مشینری تک سب اس کے ہاتھ کی لگی ہے۔

یہ بہت بڑا وصف ہے۔ اتنا بڑا کہ اس کے اور دوسروں کے لیے نقصان وہ ثابت ہوا ہے۔ ہر بات میں عملی طور پر دخل دینے سے اس نے کئی گڑبڑ گھوٹالے (بمبئی کی زبان میں) کیے ہیں۔ یوں وہ بڑے ٹھاٹ سے رہتا ہے۔ لیکن میں آپ کو ایک پُر لطف قصہ سناتا ہوں۔

یہاں لاہور میں آکر بھی وہ میرا دوست رہا۔ اکثر میری مدد کرتا رہا ہے۔ ایک بار میں اس کے پاس گیا۔ اس کی بے داغ سفید قمیص کے بٹن موجود نہیں تھے۔

میں نے اپنی حیرت کا اظہار کیا۔ کہ یہ کیا قصہ ہے ؟
اس نے مسکرا کر کہا، "کیا بتاؤں یار ۔۔۔ پیسے ہی
نہیں کہ بٹن خرید سکوں ۔"
جب میں نے اس سے سگریٹ طلب کیا تو اس
نے مجھے بتایا کہ دس روز سے وہ سگریٹ ادھار لے
رہا ہے ۔۔۔ "
یہ اس شخص کی حالت تھی جس کے اسٹڈیو میں
لوگوں کو ریفریجیٹر سے ٹھنڈا پانی ملتا ہے۔ جہاں پر پھول
کھلتے ہیں۔ جہاں کئی مالی کام کرتے ہیں۔ جہاں سینکڑوں
مزدور ہیں۔ جہاں نورجہاں ہے جو اعلےٰ سے اعلیٰ کپڑے
پہنتی ہے۔ اور موٹروں میں گھومتی ہے ۔
نورجہاں کے متعلق کئی افواہیں مشہور ہیں۔ بہت
ممکن ہے کہ ان میں سے کچھ حقیقت پر مبنی بھی ہوں۔
لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ دو نہایت پیارے بچوں
کی ماں ہے جو چیفس کالج کے صاف ستھرے ماحول
میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور وہ ان سے پیار کرتی ہے
پچھلے دنوں چیفس کالج میں ایک جلسہ تھا۔ جس میں
چند ننھے منے بچوں نے حصہ لیا تھا۔ اس میں ایک ڈانس
تھا۔ رادھا کرشنا ڈانس۔ نورجہاں کا بڑا لڑکا ایک گوپی بنا ہوا
تھا۔ اس نسوانی لباس میں وہ بہت پیارا دکھائی دے رہا تھا۔

اس کا رقص بھی بہت خوب تھا۔

نور جہاں یقیناً رقص جانتی ہے۔ معلوم نہیں اس نے اپنے اکبر کو خود تعلیم دی ہے یا وہ خود بخود خون کے ذریعے سے یہ سب کچھ سیکھا ہے۔ بہرحال اب دیکھنا یہ ہے کہ اکبر اور اصغر جو کہ چیفس کالج میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، آگے چل کر کیا بنتے ہیں؟

کیا یہ بیری موروں اور پرانی راجوں کا خاندان بنے گا؟ — فی الحال ہم اس کے متعلق کیا کچھ کہہ سکتے ہیں؟

نور جہاں ذرا بد دماغ ہے۔ اس کو اپنے حسن پر تو ناز نہیں ہونا چاہیئے کہ ایسی کوئی چیز اس میں نہیں ہے۔ ایک فقط آواز ہے، گلا ہے، جو نور سے بھرا ہے۔ اس پر اگر اسے ناز ہے تو بجا ہے۔ مگر بد دماغ ہونے کا پھر بھی کوئی صحیح جواز نہیں۔

مجھے یاد ہے۔ ایک مرتبہ میری بیوی نے بمبئی میں مجھ سے کہا۔ "آپ نور جہاں کو جانتے ہیں۔ وہ ہمارے گھر کئی مرتبہ آچکی ہے۔ کیا وہ اب نہیں آسکتی۔ میری چند سہیلیاں اس سے ملنا چاہتی ہیں۔"

میں نے اس سے کہا۔ "کیوں نہیں آسکتی۔ ہزار مرتبہ آسکتی ہے۔"

میں نے شوکت سے کہا تو اس نے دوسرے ہی روز

اسے بھیج دیا۔ میں نے بہت سی ایکٹریسیں دیکھی ہیں۔ بڑے اونچے پائے کی، بہت مشہور، بہت معروف، مگر ان میں مجھے وہ تکلّف نظر نہ آیا جو نورجہاں میں ہے۔ وہ بنتی ہے۔ اس کی مسکراہٹ، اس کی ہنسی، اس کا سلام، اس کی مزاج پُرسی۔ سب مصنوعی ہوتی ہے۔ معلوم نہیں یہ چیز اس کی طبیعت میں کیسے داخل ہوئی۔ بعض اوقات جب میں اس کی اور شوکت کی ازدواجی زندگی کا تصور کرتا ہوں تو مجھے وہ بھی مصنوعی سی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ ایسی نہیں!

نورجہاں آئی، سب سے بڑے پُرخلوص، تپاک سے، جسے میں اب بھی مصنوعی سمجھتا ہوں، ملی۔ میں تو چاہتا تھا کہ عورتوں کو چھوڑ کر چلا جاؤں کہ وہ آزادانہ طور پر گفتگو کر سکیں گی۔ مگر میری بیوی کی ایک سہیلی نے اصرار کیا کہ میں موجود رہوں اور نورجہاں سے کہوں کہ وہ گانا گائے۔

چنانچہ میں نے فوراً بڑے بے تکلف انداز میں نورجہاں سے کہا کہ بھئی ایک دو گانے ہو جائیں کہ یہ لوگ تمہاری آواز کا " زندہ ناچ و گانا " سننا اور دیکھنا چاہتی ہیں۔

نورجہاں نے ایک پُرتکلف ادا سے جواب دیا۔ " نہیں منٹو صاحب! پھر کبھی — میرا گلا ٹھیک نہیں۔"

میں کباب ہو گیا۔ اس کا گلا بالکل ٹھیک تھا۔ اس کا گلا فولاد کا گلا ہے جو کبھی خراب ہی نہیں ہو سکتا۔ صریحاً نخرے کر رہی تھی۔ میں نے اس سے پھر کہا۔ " نور جہاں! یہ بہانہ نہیں چلے گا — تمہیں گانا پڑے گا۔ میں تو تمہیں ہزار مرتبہ سن چکا ہوں۔ مگر ان لوگوں کو اشتیاق ہے، اس لیے تمہیں اچھے برے گلے کے ساتھ ہی گا دینا چاہیئے ۔"

بہت دیر تک اُدھر سے انکار، اِدھر سے اصرار ہوتا رہا۔ میری بیوی نے کہا، جانے دو، جب وہ نہیں گانا چاہتیں تو آپ اس قدر زور کیوں دیتے ہیں۔ مگر... میں بھی ایک ضدی ہوں، نور جہاں کے پیچھے پڑ گیا۔ آخر اس کو فیض کی وہ غزل گانی پڑی۔ ؎

آج کی رات سازِ دلِ پُر درد نہ چھیڑ

کم بخت نے کیا دھن بنائی تھی اور کیا آواز تھی کہ اب اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی میرے کان اس شہد بھری آواز کو سن سکتے ہیں۔

نور جہاں کے کئی عاشق ہوں گے۔ میں ایسے کئی باورچیوں کو جانتا ہوں جو چولھے کے پاس نور جہاں کی تصویریں لگا کر اپنے صاحبوں اور میموں وغیرہ کا کھانا پکاتے ہیں اور اس کے گائے ہوئے گیت اپنی کن سُری

آوازوں میں گاتے ہیں۔
اور میرے گھر میں اُس کا ایک عاشق زار موجود ہے۔ وہ ہر خوبصورت لڑکی، ہر دلہن، ہر سرخپوش عورت کو نور جہاں کہتا ہے۔ اس کو نور جہاں کے گائے ہوئے گانے قریب قریب سب یاد ہیں۔ وہ خود بھی بڑا حسین ہے لیکن جانے اسے نور جہاں کی کون سی ادا بھا گئی ہے کہ وہ دن رات اسی کا ذکر کرتا ہے۔

وہ میرا قریب ترین عزیز ہے۔ میری سالی اور میرے بھانجے کا لڑکا ہے۔ اس کا نام شاہد جلال ہے۔ ہم سب اسے پیار سے ٹاکو کہتے ہیں۔ اس کو ہم سب بہت سمجھا بجھا چکے ہیں کہ دیکھو تم نور جہاں کا خیال چھوڑ دو۔ وہ ایک بیاہتا عورت ہے جس کے کئی بچے ہیں۔ تمہاری اور اس کی شادی نہیں ہوسکتی۔ مگر وہ نہیں مانتا۔

فلم دیکھتا ہے لیکن اگر اس میں نور جہاں نہ ہو تو اُسے بہت کوفت ہوتی ہے۔ یہ کوفت وہ گھر آکر نور جہاں کے گائے ہوئے گانے گا کر دُور کرتا ہے۔ اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے کہتا ہے کہ مجھے اور کوئی نہیں چاہیئے، صرف نور جہاں چاہیئے۔

پچھلے دنوں اس کے دادا میاں جلال دین، شوکت رضوی کے پاس گئے تھے اور انھوں نے اس سے کہا تھا کہ دیکھو! تمہاری بیوی کا ایک عاشق پیدا ہوگیا ہے جو

بڑی طرح اس پر لٹو ہے۔ البتہ نہ ہو کہ وہ کسی روز نورجہاں کو لے اُڑے اور تم منہ دیکھتے رہ جاؤ۔"

وہ بہت حیران ہوا۔ اس لیے کہ میاں صاحب موصوف نے یہ بات شوکت کو بتائی تھی۔ پہلے تو وہ جھینپا، پھر اس نے پوچھا۔ "میاں صاحب! وہ کون شخص ہے؟"

میاں صاحب نے مسکرا کر اس سے کہا۔ "میرا پوتا۔"

"آپ کا پوتا؟ — کیا عمر ہے اس کی؟"

میاں صاحب نے جواب دیا — "یہی! چار برس کے قریب — !"

یہ حال ہی کی بات ہے۔ نورجہاں نے جب یہ سادی بات سنی تو بہت محظوظ ہوئی۔ اس نے کہا۔ "میں خود اپنے عاشق کے پاس جاؤں گی اور اس سے شادی کر لوں گی۔"

شاہد جلال بہت خوش ہے کہ وہ اس دن کا بڑی بے تابی سے انتظار کر رہا ہے۔ جب نورجہاں خود اس کے پاس چل کر آئے گی۔ اور وہ اسے اپنی دلہن بنا لے گا۔

پچھلے دنوں نورجہاں کے ایک اور عاشق کا قصّہ سننے میں آیا تھا۔ مگر وہ چار برس کا نہیں تھا۔ اچھا خاصا جوان تھا اور غالباً نائی یعنی حجام تھا۔ ہر وقت اس کے گائے ہوئے گانے گاتا رہتا تھا اور اسی کی باتیں کرتا تھا۔ ایک آدمی نے اُس سے کہا۔ "کیا واقعی تمہیں

نورجہاں سے محبّت ہے ؟"

حجام نے بڑے پُرخلوص انداز میں اسے جواب دیا:

" اس میں کیا شک ہے۔"

اس کے دوست نے اس کا امتحان لینا چاہا۔ اگر تمہیں اس سے سچی محبت ہے تو کیا مہینوال کی طرح تم اس کے لیے اپنا گوشت دے سکتے ہو؟ کہ کباب بنا کر اسے بھیجے جائیں ؟"

حجام نے تیز استرا نکال کر اپنے ہاتھ میں دے دیا اور اپنے دوست سے کہا۔" جہاں سے چاہو، تم میرا گوشت کاٹ لو۔"

اس کا دوست بھی معلوم نہیں، کس قسم کا انسان تھا کہ اس نے اس کے بازو سے پاؤ بھر گوشت کا ٹکڑا اُسترے سے کاٹ کر الگ کر دیا اور خود بھاگ گیا، کہ حجام صاحب اس قربانی کے بعد خون کے بہاؤ کے باعث بے ہوش ہو گئے۔

اس عاشق زار کو جب میو ہسپتال میں داخل کیا گیا اور جب اس کو تھوڑا سا ہوش آیا تو اس کی زبان پر نورجہاں کا نام تھا۔

نورجہاں کا خاوند بانکا چھبیلا سید شوکت حسین رضوی موجود ہے۔ اس کی خوبصورت اولاد ہے۔ وہ

مال ہے۔ اس کے لیے لاہور کا حجام اپنی ران کا
نہیں تو اپنے بازو کا پاؤ بھر گوشت دے سکتا
ہے۔ اس کا چار برس کا معصوم عاشق شاہد جلال
عرف ٹاکو ہے جو ہر وقت اس کو دُلہن بنانے کے
خواب دیکھتا رہتا ہے۔ وہ باورچی ہیں جو اس کی
تصویر چولھے کے پاس رکھ کر کھانا پکاتے ہیں۔ جو
برتن مانجھتے وقت اس کے گانے ہوئے گانے اپنی
گن سُری آواز میں گاتے ہیں۔ اور یوں اپنی مشقت
کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں۔ اور ایک میں ہوں کہ جو اُس
کی واہیات انگیا دیکھ کر اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں —
معلوم نہیں، وہ اتنی اُٹھان ہیں کیا خوبصورتی دیکھتی
ہے۔ اور سید شوکت حسین رضوی اس زیادتی کی
اجازت کیوں دیتا ہے، جو باذوق نگاہوں پر بہت
گراں گزرتی ہے ❊

سعادت حسن منٹو

منٹو نہ تو کسی کو شرم دلاتا ہے نہ کسی کو راہِ راست پر لانا چاہتا ہے۔ وہ تو بڑی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ انسان سے یہ کہتا ہے کہ تم اگر چاہو بھی تو بھٹک کے بہت دُور نہیں جا سکتے۔ اس اعتبار سے منٹو کو انسانی فطرت پر کہیں زیادہ بھروسہ نظر آتا ہے۔

محمد حسن عسکری

"منٹو نے زندگی کے زہراب کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ چھُوا ہے، چکھا ہے اور اب وہ ایک نشتر بن کر سماج کے فاسد مادے کو خارج کرنا چاہتا ہے۔ مریض چیختا ہے، چلّاتا ہے، بین کرتا ہے، منٹو کو اس کی پروا نہیں وہ اس قدر بے رحم ہے کہ کلوروفارم دینا بھی پسند نہیں کرتا۔

کرشن چندر

"منٹو آدم کی جراُتِ گناہ کا قائل ہے۔ منٹو کا انسان نوری ہے نہ ناری، وہ آدمِ خاکی ہے —— وہ وجودِ خاکی جس میں بنیادی گناہ، فساد، قتل و خون وغیرہ کے باوجود۔ خدا نے نوری فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں۔

ممتاز شیریں

مکتبۂ شعر و ادب، سمن آباد، لاہور ۲۵